جمادی الاخریٰ ۱۴۳۴ھ
اپریل ۲۰۱۳ء

ماہنامہ

# میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

**وحدتِ اَدیان کا باطل تصور**

سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۲ کی آڑ میں

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ


داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمۂ قرآن پر مشتمل

## بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

**حصہ اول** سُورۃ الفاتحہ و سُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات: 360، قیمت 450 روپے

**حصہ دوم** سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 400 روپے

**حصہ سوم** سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
(دوسرا ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 400 روپے

**حصہ چہارم** سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(پہلا ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 450 روپے

★ عمدہ طباعت ★ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ★ امپورٹڈ پیپر

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا پشاور
A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2584824,2214495(091)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ: ۷)
ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی!

# ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

جلد : 62
شمارہ : 4
جمادی الاخریٰ 1434ھ
اپریل 2013ء
فی شمارہ -/25

مدیر
حافظ عاکف سعید
نائب مدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون
- اندرونِ ملک 250 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور
مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

# مشمولات

**عرضِ احوال** ———— 3
آئینِ جواں مرداں......! — ایوب بیگ مرزا

**بیانُ القُرآن** ———— 5
سورۂ یوسف (آیات ۱ تا ۳۵) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

**تذکرہ و تبصرہ** ———— 25
وحدتِ ادیان کا باطل تصور — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۲ کی آڑ میں

**تعمیر سیرت** ———— 45
امر بالمعروف ونہی عن المنکر — عتیق الرحمٰن صدیقی

**تذکیر و موعظت** ———— 53
نماز باجماعت کی اہمیت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

**یاد رفتگاں** ———— 60
مسعود اقبال مرحوم: صاحبِ قلبِ سلیم — پروفیسر خورشید عالم

**نقد و نظر** ———— 65
''جب زندگی شروع ہوگی'' — انجینئر حافظ نوید احمد
گمراہ کن تصورات کی تبلیغ، شاطرانہ اسلوب میں

**حقوق و فرائض** (۷) ———— 85
والدین کے فرائض، اولاد کے حقوق — بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

# آئینِ جواں مرداں......!

اللہ تعالیٰ نے اپنی کُل مخلوقات میں سے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا اور اپنی اس بہترین تخلیق میں سے بھی انبیا و رُسل علیہم السلام کو اعلیٰ ترین مقام عطا فرمایا۔ سچ پوچھیے تو حقیقت یہ ہے کہ انسان ہونے کے باوجود انبیاء اور رُسل کی کیٹگری ہی الگ ہے۔ وہ مامور من اللہ ہوتے ہیں' معصوم عن الخطا ہوتے ہیں۔ وہ حق کا سمبل ہوتے ہیں۔ حق اور سچ اُن سے شروع ہو کر اُن ہی پر ختم ہوتا ہے۔ اُن کا ساتھ دینے والا حق کا ساتھی کہلاتا ہے اور اُن کا مخالف باطل اور باطلِ محض ہوتا ہے۔ چاہے ظاہری طور پر اُس کا دنیا میں بڑا اونچا مقام ہی کیوں نہ ہو' حقیقت میں وہ پستی کا مکین ہوتا ہے اور ذلت و رسوائی اُس کا مقدر ہوتی ہے۔ ایک بات اور طے شدہ ہے کہ غیر نبی تقویٰ اور نیکی کی معراج تک ہی کیوں نہ پہنچ جائے وہ انبیاء و رُسل علیہم السلام کے مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ ایک انسان تھے' دوسرے عام انسانوں کی طرح جن کے خمیر میں نسیان ہوتا ہے۔ بھول چوک اور خطا سے وہ مبرّا نہیں ہوتے۔ لیکن ان بشری تقاضوں کے علی الرغم وہ اتنے عظیم اور قد آور انسان تھے کہ ہمیں انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیے جانے کی وجہ سمجھ آتی ہے۔ اُن کی اللہ کی کتاب اور نبی آخر الزمان ﷺ کے فرمودات سے والہانہ محبت دیدنی تھی۔ علاوہ ازیں وطن عزیز میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے نفاذ کی خواہش اس بندۂ خدا کے جسم و جان میں گندھی ہوئی تھی۔

بانی تنظیم اسلامی اور مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے حوالے سے بات آگے بڑھانے سے پہلے ہم یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ برسی منانے' عرس منعقد کرنے' یادگاریں تعمیر کرنے' بزرگوں کی قبروں پر خانقاہیں تعمیر کرنے' آستانے قائم کرنے اور وہاں میلے منعقد کرنے کے بارے میں ہم کوئی فتویٰ تو نہیں دیتے' لیکن یہ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور ہمارے مزاج کے سخت خلاف ہے۔ اگرچہ بزرگانِ دین اور اپنے اَسلاف سے عقیدت اور محبت اُن کے اور ہمارے ایمان کا حصہ ہے لیکن اس میں غلو اور اِس آڑ میں غیر شرعی



حرکات کسی صورت قبول نہیں کی جاسکتیں۔ ہم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے جو یہ چند سطور تحریر کر رہے ہیں تو دل ڈر رہا ہے اور ذہن بڑی مشکل سے اس پر آمادہ ہوا ہے' اس لیے کہ شخصیت پرستی ہمارے نزدیک انتہائی قابلِ نفرت اور مذموم فعل ہے۔ لیکن ہر دور میں ایک مسئلہ رہتا ہے کہ وقت کے نوجوانوں کو کسی اعلیٰ اور ارفع مقصد کے حصول پر آمادہ کرنے کے لیے اسی دنیا کے انسانوں کی مثال دینا پڑتی ہے۔ انسان کی خصلت ہے کہ وہ بڑے لوگوں اور اُن کے بڑے کارناموں سے inspire ہوتا ہے۔ زندہ مثال پیش کر کے اُن پر اتمامِ حجت کرنا مقصود ہوتا ہے' کہ آخر ایک جیسی جسمانی ساخت رکھتے ہوئے اور ایسے ہی حالات و واقعات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم عظمت کے ان پہاڑوں کی بھرپور پیروی کیوں نہیں کر سکتے؟ ہم ایک عظیم مشن کی خاطر حالات کی ناموافقت سے کیوں نہیں لڑ سکتے؟ ہم آخرت کو دنیا پر ترجیح کیوں نہیں دے سکتے؟

ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے محبت کرنے والے ہر مرد و زن کو جان لینا چاہیے کہ تین جہتوں میں محنت اور مشقت انسان کو بڑا بنا سکتی ہے۔

(۱) انسان اپنی ذات اور اہل خانہ کے لیے جان جوکھوں میں ڈالے اور اس دنیا میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لیے اپنا تن من جھونک دے۔

(۲) اپنی قوم اور ملک کے لیے زندگی وقف کر دے۔ اس مقصد کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دے اور اپنی صلاحیتوں کو نچوڑ کر قوم پر نچھاور کر دے۔ اس حوالہ سے مخلصانہ کوششیں انسان کو خواہی نخواہی دنیا میں ایک بڑا مقام دلا دیتی ہیں۔

(۳) تیسری جہت یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کے دین اور آخرت کمانے کے لیے لگا دے اور کوئی دنیوی غرض نہ ہو۔ یہاں تک کہ جان کی بازی بھی لگا دے اور شہادت فی سبیل اللہ کا مقام و مرتبہ حاصل کر لے۔

ظاہر ہے' پہلی جہت انتہائی ارزاں' عارضی اور گھٹیا نوعیت کی ہے' جبکہ محنت اور جِدّوجُہد کی تیسری اور آخری جہت انسانی عظمت کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے اور وہ دنیا جس کا وہ طالب نہیں ہوتا' وہ خود بعض اوقات اُس کی زندگی ہی میں اُس کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہے اور بعض اوقات دنیا بعد از مرگ اُسے احترام و تکریم کے حوالے سے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتی

(باقی صفحہ 94 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

# سُورۃ یُوسُف

## تمہیدی کلمات

چودہ مکی سورتوں (سورۂ یونس تا سورۃ المؤمنون) پر مشتمل اس طویل سلسلے میں تین تین سورتوں کے جو ذیلی گروپس ہیں' سورۂ یوسف ان میں سے پہلے ذیلی گروپ کا حصہ ہے' لیکن اس سورت کو اپنے مضمون اور خاص انداز کی بنا پر پہلی دو سورتوں (سورۂ یونس اور سورۂ ہود) کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سورۂ یوسف پورے قرآن مجید میں اپنے انداز کی ایک بالکل منفرد سورت ہے۔ اس کی ہلکی سی مشابہت صرف سورۂ طٰہٰ کے ساتھ ہے۔ سورۂ طٰہٰ بھی سورۂ یوسف کی طرح صرف ایک رسول یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ ان دونوں سورتوں میں اس کے علاوہ ایک معنوی نسبت یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں اور آپؑ کی وساطت سے بنی اسرائیل مصر میں داخل ہوئے تھے' جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں آپؑ کے ذریعے سے وہ لوگ وہاں سے نکلے تھے۔

اس سے پہلے مکی سورتوں میں انباء الرسل کا مضمون بہت شدّ و مدّ کے ساتھ بیان ہوا ہے' جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قصص النبیین کے انداز میں آیا ہے' پہلے سورۃ الانعام میں اور پھر سورۂ ہود میں۔ مگر سورۂ یوسف قِصص النبیین کے اعتبار سے بھی یوں منفرد ہے کہ پوری سورت ایک ہی نبی کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس پورے قصے میں انباء الرسل کے انداز کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ یعنی اس طرح کا کوئی اشارہ کہیں بھی نہیں ملتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے' یا پھر انہوں نے اپنی قوم کو دعوتِ توحید دینے کے بعد کہا ہو کہ اگر تم میری اس دعوت کو نہیں مانو گے تو تم پر اللہ کا عذاب آئے گا۔ پوری سورت میں ہمیں ان کی طرف سے جا بجا دعوت کی مثالیں ملتی ہیں مگر وہ ایک مصلح کے انداز میں تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے نبی اور رسول کے مابین فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ رسولوں کے حالات



کے ضمن میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ ایک رسول کی بعثت تعیّن کے ساتھ جس قوم کی طرف ہوتی تھی وہ انہیں اللہ واحد کی بندگی اور اپنی اطاعت کا حکم دیتا تھا: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝۳﴾ (نوح) ''کہ تم اللہ کی بندگی کرو' اُس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔ اور اگر وہ قوم اپنے رسول کی دعوت کو رد کرتی چلی جاتی تھی تو بالآخر اُس قوم پر اللہ کی طرف سے عذاب نازل ہو جاتا تھا اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا تھا —— لیکن نبی کا معاملہ اولیاء اللہ کی طرح ہوتا تھا۔ وہ اپنے معاشرے میں توحید کی دعوت دیتا' کفر و شرک اور بدعات سے اجتناب کی تلقین کرتا اور ان کی اصلاح کی کوشش کرتا۔ بنی اسرائیل میں انبیاء کرام علیہم السلام تسلسل کے ساتھ آتے رہے ہیں' لیکن رسول معدودے چند تھے۔ اُمت مسلمہ میں بڑے بڑے اولیاءِ کرام رحمہم اللہ پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے عظیم الشان دعوتی اور تجدیدی خدمات انجام دی ہیں' لیکن وحی کا دروازہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد بند ہو چکا ہے۔

اس سورت کے نزول اور اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات کی اس قدر تفصیل بیان کرنے کا بنیادی سبب تو یہ ہے کہ محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی خبریں جب یہودِ مدینہ تک پہنچیں تو انہوں نے تورات کی معلومات کی بنیاد پر شرارتاً مشرکین مکہ کو مختلف سوالات بھیجنے شروع کر دیے' جو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے رہتے تھے۔ ان سوالات میں ایک اہم سوال یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل کے بارے میں آپؐ یہ واقعات تو بیان کر رہے ہیں کہ مصر میں فرعون اُن پر ظلم کرتا تھا اور وہاں وہ غلامانہ زندگی بسر کر رہے تھے اور پھر حضرت موسیٰؑ اُن کو وہاں سے نکال کر لے گئے' مگر بنی اسرائیل کے جدّ امجد حضرت ابراہیم' حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام تو فلسطین میں آباد تھے' ان کے بارے میں یہ بھی بتائیں کہ وہاں سے یہ لوگ مصر میں کیسے پہنچ گئے؟ یہ تاریخ کا ایک سوال تھا' جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ پورا واقعہ اس سورت میں بہت ہی خوبصورت انداز میں بیان فرما دیا' بلکہ اس قصے کو قریش کے اس طرزِ عمل پر بھی منطبق کر دیا جو وہ برادرانِ یوسف کی مانند نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روا رکھے ہوئے تھے۔

میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ قرآن حکیم کے ساتھ میرا جو ذہنی و قلبی رشتہ اور معنوی ربط و تعلق قائم ہوا اس کا نقطۂ آغاز یہی سورۂ یوسف بنی' جب میں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے قلم سے اس کی تفسیر کا مطالعہ کیا۔ میں نے ۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ مشرقی پنجاب میں فسادات شروع ہو گئے اور مسلمانوں کا قتل عام ہونے لگا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ تک ہم

اپنے شہر حصار میں محصور رہے۔ ہم نے اپنی حفاظت کے لیے مورچے قائم کر لیے تھے‘ جن میں شہر کے نوجوان اپنی باری سے ڈیوٹی دیتے۔ فارغ وقت میں‘ میں اور میرے بڑے بھائی اظہار احمد ایک مسجد میں بیٹھ کر مطالعہ کرتے۔ اُن دنوں مولانا مودودیؒ کے ماہنامہ ترجمان القرآن میں ’’تفہیم القرآن‘‘ کے سلسلے میں سورۂ یوسف کی تفسیر شائع ہو رہی تھی۔ میں نے بھی میٹرک میں عربی کا مضمون رکھا تھا اور بھائی جان نے بھی جب میٹرک کیا تھا تو عربی پڑھی تھی۔ چنانچہ ہم مل کر سورۂ یوسف کی تفسیر کا مطالعہ کرتے اور اس پر باہم مذاکرہ کرتے۔ قرآن حکیم کی تلاوت اور ترجمے کی مدد سے اس کو سمجھنے کا معاملہ تو پہلے سے ہی تھا‘ لیکن اس تفسیری مطالعے اور مذاکرے سے قرآن حکیم کے ساتھ ذہنی وقلبی رشتہ استوار رہا۔

## آیات ۱ تا ۶

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۞ اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۞ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۞ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۞

**آیت ۱** ﴿الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ①﴾ ’’ا‘ ل‘ ر۔ یہ ایک روشن کتاب کی آیات ہیں۔‘‘

یہ اُس کتاب روشن کی آیات ہیں جو اپنا مدعا واضح طور پر بیان کرتی ہے اور کوئی ابہام باقی



نہیں رہنے دیتی۔

**آیت ۲** ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا﴾ ’’ہم نے اس کو نازل کیا ہے عربی قرآن بنا کر‘‘

یعنی وہ قرآن جو اُمّ الکتاب اور لوحِ محفوظ میں ہمارے پاس ہے‘ اس کو ہم نے قرآنِ عربی بنا کر محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ②﴾ ’’تاکہ تم لوگ اسے اچھی طرح سے سمجھ سکو۔‘‘

یہ خطاب عرب کے اُمّیّین سے ہے کہ ہمارے آخری رسول ﷺ کی اوّلین بعثت تمہاری طرف ہوئی ہے۔ آپ ﷺ کے مخاطبینِ اولین تم لوگ ہو۔ چنانچہ ہم نے قرآن کو تمہاری اپنی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ تم لوگ اسے اچھی طرح سمجھ سکو۔

**آیت ۳** ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) ہم آپ کو سنانے لگے ہیں بہترین بیان‘‘

قَصَص (ق کی زبر کے ساتھ) یہاں بطور مصدر آیا ہے اور اس کے معنی ہیں ’’بیان‘‘۔ اگر لفظ قِصَص (ق کی زیر کے ساتھ) ہوتا تو قصہ کی جمع کے معنی دیتا‘ اور اس صورت میں اس کا ترجمہ یوں ہوتا کہ ہم آپ ﷺ کو بہترین قصہ سنا رہے ہیں۔

﴿بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ③﴾ ’’اس قرآن کے ساتھ جو ہم نے آپؐ کی طرف وحی کیا ہے‘ اور یقیناً آپؐ اس سے پہلے (اس سے) ناواقف تھے۔‘‘

یعنی قرآن میں اس وحی (سورت) کے نزول سے پہلے آپ ﷺ اس واقعہ سے واقف نہیں تھے۔

**آیت ۴** ﴿اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ﴾ ’’جب یوسفؑ نے اپنے والد (یعقوبؑ) سے کہا‘‘

حضرت یعقوب علیہ السلام کی بڑی بیوی سے آپؑ کے دس بیٹے تھے اور وہ سب کے سب اُس وقت تک جوانی کی عمر کو پہنچ چکے تھے‘ جبکہ آپؑ کے دو بیٹے (یوسفؑ اور بن یامین) آپؑ کی چھوٹی بیوی سے تھے۔ اِن میں حضرت یوسفؑ بڑے تھے‘ مگر ابھی یہ دونوں ہی کم سن تھے۔

﴿يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ④﴾ ’’ابا جان! میں نے خواب میں دیکھا ہے گیارہ ستاروں اور سورج اور

چاند کو‘ میں نے اُن کو دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔‘‘

**آیت ۵** ﴿قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ﴾ ’’یعقوبؑ نے فرمایا: اے میرے پیارے بیٹے! اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا‘‘

حضرت یعقوب علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ اس خواب میں یوسفؑ کے گیارہ بھائیوں اور ماں باپ کے بارے میں کوئی اشارہ ہے اور شاید اللہ تعالیٰ میرے اس بیٹے کے لیے کوئی خاص فضیلت ظاہر کرنے والا ہے۔

﴿فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ﴾ ’’ورنہ وہ تمہارے خلاف کوئی سازش کریں گے۔‘‘

ممکن ہے وہ لوگ خواب سن کر اس میں واضح اشارے کو بھانپ لیں تو ان کے اندر حسد کی آگ بھڑک اُٹھے اور پھر وہ تمہارے خلاف کوئی سازش کریں‘ تمہیں گزند پہنچانے کی کوشش کریں۔

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۵﴾ ’’یقیناً شیطان تو انسان کا کھلا دشمن ہے۔‘‘

وہ دشمنی میں کسی کو بھی کسی بھی وقت‘ کوئی بھی پٹی پڑھا سکتا ہے۔

**آیت ۶** ﴿وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ﴾ ’’اور اسی طرح تمہارا ربّ تمہیں منتخب کرے گا‘‘

حضرت یعقوب علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ میرے بیٹوں میں سے یوسفؑ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے لیے چن لیا ہے۔

﴿وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ ’’اور تمہیں سکھائے گا تاویل الاحادیث میں سے (علم)‘‘

یہاں پر تاویل حدیث کے دو معنی ہو سکتے ہیں‘ ایک خوابوں کی تعبیر اور دوسرے معاملہ فہمی اور دور بینی‘ باتوں کی کُنہ (تہ) تک پہنچ جانا‘ حقیقت تک رسائی ہو جانا۔

﴿وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ﴾ ’’اور اِتمام فرمائے گا اپنی نعمت کا تجھ پر اور آلِ یعقوبؑ پر جس طرح اُس نے اس سے پہلے اپنی نعمت کا اِتمام فرمایا تیرے آباء واَجداد ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر۔‘‘

یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے کسرِ نفسی کے سبب حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق علیہما السلام کے ساتھ اپنا نام نہیں لیا۔

﴿اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶﴾ ’’یقیناً تیرا رب جاننے والا‘ حکمت والا ہے۔‘‘



# آیات ۷ تا ۲۰

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝۷ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ
اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِۚ ۝۸ اقْتُلُوْا
يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا
صٰلِحِيْنَ ۝۹ قَالَ قَاۗىِٕلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ
يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝۱۰ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا
عَلٰي يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝۱۱ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ
لَحٰفِظُوْنَ ۝۱۲ قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ
وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝۱۳ قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا
لَّخٰسِرُوْنَ ۝۱۴ فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ
اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۵ وَجَاۗءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَاۗءً
يَّبْكُوْنَ ۝۱۶ۭ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ
الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ۝۱۷ وَجَاۗءُوْ عَلٰي قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ
كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ
الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ ۝۱۸ وَجَاۗءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى
دَلْوَهٗ ۭ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ۭ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ ۝۱۹ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ
الزّٰهِدِيْنَ ۝۲۰ۧ

**آیت ۷** ﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝۷﴾ ’’یقیناً یوسفؑ اور آپؑ کے بھائیوں (کے قصے) میں (بہت سی) نشانیاں ہیں پوچھنے والوں کے لیے۔‘‘

یعنی جن لوگوں (قریشِ مکہ) نے یہ سوال پوچھا ہے اور جن لوگوں (یہودِ مدینہ) کے

کہنے پر پوچھا ہے' ان سب کے لیے اس قصے میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ اگر وہ صرف اس ایک قصے کو حقیقت کی نظروں سے دیکھیں اور اس پر غور کریں تو بہت سے حقائق نکھر کر اُن کے سامنے آجائیں گے۔

**آیت ۸** ﴿اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ﴾ ''جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں جبکہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں۔''

برادرانِ یوسف نے کہا کہ ہم پورے دس لوگ ہیں' سب کے سب جوان اور طاقتور ہیں' خاندان کی شان تو ہمارے دم قدم سے ہے (قبائلی زندگی میں نوجوان بیٹوں کی تعداد پر ہی کسی خاندان کی شان و شوکت اور قوت و طاقت کا انحصار ہوتا ہے) لیکن ہمارے والد ہمیں نظرانداز کر کے ان دو چھوٹے بچوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

﴿اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۨ ⑧﴾ ''یقیناً ہمارے والد صریح غلطی پر ہیں۔''

**آیت ۹** ﴿اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ﴾ ''(چنانچہ) قتل کر دو یوسف کو یا اسے پھینک آؤ (دور) کسی علاقے میں تاکہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو جائے''

یوسف چونکہ ان دونوں میں بڑا ہے' اس لیے وہی والد صاحب کی ساری توجہ اور عنایات کا مرکز و محور بنا ہوا ہے' چنانچہ جب یہ نہیں رہے گا تو لامحالہ والد صاحب کی تمام تر شفقت اور مہربانی ہمارے لیے ہی ہو گی۔

﴿وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ⑨﴾ ''اور پھر اس کے بعد نیک بن جانا۔''

اس فقرے میں اُن کے نفس اور ضمیر کی کشمکش کی جھلک صاف نظر آ رہی ہے۔ ضمیر تو مسلسل ملامت کر رہا تھا کہ یہ کیا کرنے لگے ہو؟ اپنے بھائی کو قتل کرنا چاہتے ہو؟ یہ تمہاری سوچ درست نہیں ہے! لیکن عام طور پر ایسے مواقع پر انسان کا نفس اس کے ضمیر پر غالب آجاتا ہے' جیسا کہ ہم نے سورۃ المائدۃ' آیت ۳۰ میں ہابیل اور قابیل کے سلسلے میں پڑھا تھا: ﴿فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ﴾ ''پس قابیل کے نفس نے اُسے آمادہ کر ہی لیا اپنے بھائی کے قتل کرنے پر۔''



اسی طرح ان لوگوں نے بھی اپنے ضمیر کی آواز کو دبا کر آپس میں مشورہ کیا کہ ایک دفعہ یہ کڑوا گھونٹ حلق سے اتار لو' پھر اس کے بعد توبہ کر کے اور کفارہ وغیرہ ادا کر کے کسی نہ کسی طرح اس جرم کی تلافی کر دیں گے اور باقی زندگی نیک بن کر رہیں گے۔

**آیت ۱۰** ﴿قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ﴾ ''کہا ان میں سے ایک کہنے والے نے کہ یوسف کو قتل مت کرو''

یہ شریف النفس انسان اُن کے سب سے بڑے بھائی تھے جنہوں نے یہ مشورہ دیا۔ ان کا نام یہودا تھا' اور انہی کے نام پر لفظ ''یہودی'' بنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اصل مسئلہ تو اس سے پیچھا چھڑانے کا ہے' لہٰذا ضروری نہیں کہ قتل جیسا گناہ کر کے ہی یہ مقصد حاصل کیا جائے' اس کے لیے کوئی دوسرا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

﴿وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ﴾ ''اور ڈال آؤ اسے کسی باؤلی کے طاقچے میں' اٹھا لے جائے گا اس کو کوئی قافلہ''

پرانے زمانے کے کنویں کی ایک خاص قسم کو باؤلی کہا جاتا تھا' اس کا منہ کھلا ہوتا تھا لیکن گہرائی میں یہ تدریجاً تنگ ہوتا جاتا تھا۔ پانی کی سطح کے قریب اس کی دیوار میں طاقچے سے بنائے جاتے تھے۔ اس طرح کی باؤلیاں پرانے زمانے میں قافلوں کے راستوں پر بنائی جاتی تھیں۔ چنانچہ اس مشورے پر عمل کی صورت میں قوی امکان تھا کہ کسی قافلے کا ادھر سے گزر ہو گا اور قافلے والے یوسف کو باؤلی سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ بڑے بھائی کے اس مشورے کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ اس طرح کم از کم یوسف کی جان بچ جائے گی اور ہم بھی اس کے خون سے ہاتھ رنگنے کے جرم کے مرتکب نہیں ہوں گے۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ⑩﴾ ''اگر تم کچھ کرنے ہی والے ہو۔''

جب نو بھائی اس بات پر پوری طرح تُل گئے کہ یوسف سے بہرحال چھٹکارا حاصل کرنا ہے تو دسواں بھائی ان کو اس حرکت سے بالکل منع تو نہیں کر سکا' لیکن اس نے کوشش کی کہ کم از کم وہ لوگ یوسف کو قتل کرنے سے باز رہیں۔

**آیت ۱۱** ﴿قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ⑪﴾ ''انہوں نے کہا: ابا جان! کیا وجہ ہے کہ آپؑ ہم پر بھروسہ نہیں کرتے یوسف کے معاملے میں' حالانکہ ہم تو اس کے بڑے خیر خواہ ہیں۔''

**آیت ۱۲** ﴿اَرۡسِلۡهُ مَعَنَا غَدًا یَّرۡتَعۡ وَیَلۡعَبۡ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۱۲﴾﴾ ’’کل ذرا اسے ہمارے ساتھ بھیجئے‘ وہ کچھ چر چگ لے گا اور کھیلے کودے گا‘ اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔‘‘

انہوں نے کہا کہ ہم کل شکار پر جا رہے ہیں‘ آپؑ یوسف کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دیجیے۔ وہاں یہ درختوں سے پھل وغیرہ کھائے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا۔ آپؑ اس کی طرف سے بالکل فکرمند نہ ہوں‘ ہم اس کی حفاظت کریں گے۔

**آیت ۱۳** ﴿قَالَ اِنِّیۡ لَیَحۡزُنُنِیۡۤ اَنۡ تَذۡهَبُوۡا بِهٖ وَاَخَافُ اَنۡ یَّاۡكُلَهُ الذِّئۡبُ وَاَنۡتُمۡ عَنۡهُ غٰفِلُوۡنَ ﴿۱۳﴾﴾ ’’یعقوبؑ نے فرمایا: مجھے یہ بات اندیشہ میں ڈالتی ہے کہ تم اسے لے جاؤ‘ اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ کھا جائے جبکہ تم اس سے غافل ہو جاؤ۔‘‘

مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ وہ تمہارے ساتھ چلا جائے‘ پھر تم لوگ اپنی مصروفیات میں منہمک ہو جاؤ‘ اس طرح وہ جنگل میں اکیلا رہ جائے اور کوئی بھیڑیا اسے پھاڑ کھائے۔

**آیت ۱۴** ﴿قَالُوۡا لَئِنۡ اَكَلَهُ الذِّئۡبُ وَنَحۡنُ عُصۡبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ ’’وہ کہنے لگے کہ اگر (ہمارے ہوتے ہوئے) اسے بھیڑیا کھا گیا جبکہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں‘ تب تو ہم بہت ہی نکمے ثابت ہوں گے۔‘‘

یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے جیسے دس کڑیل جوانوں کے ہوتے ہوئے اسے بھیڑیا کھا جائے‘ ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں۔

**آیت ۱۵** ﴿فَلَمَّا ذَهَبُوۡا بِهٖ وَاَجۡمَعُوۡۤا اَنۡ یَّجۡعَلُوۡهُ فِیۡ غَیٰبَتِ الۡجُبِّ ۚ﴾ ’’پھر جب وہ اس کو لے گئے اور سب اس پر متفق ہو گئے کہ اسے ڈال دیں باؤلی کے طاقچے میں۔‘‘

یہاں پر اَجۡمَعُوۡا کے بعد عَلٰی کا صلہ محذوف ہے‘ یعنی اس منصوبے پر وہ سب کے سب جمع ہو گئے‘ انہوں نے اس رائے پر اتفاق کر لیا۔

﴿وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمۡ بِاَمۡرِهِمۡ هٰذَا وَهُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾ ’’اور ہم نے (اُس وقت) وحی کی یوسف کو کہ تم (ایک دن) اُن کو ان کی یہ حرکت ضرور جتلاؤ گے اور انہیں اس کا اندازہ بھی نہیں ہو گا۔‘‘

یہ بات الہام کی صورت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں ڈالی گئی ہو گی‘ کیونکہ ابھی



آپؑ کی عمر نبوت کی تو نہیں تھی کہ باقاعدہ وحی ہوتی۔ بہرحال آپؑ پر یہ الہام کیا گیا کہ ایک دن تم اپنے ان بھائیوں کو یہ بات اُس وقت جتلاؤ گے جب انہیں اس کا خیال بھی نہیں ہو گا۔ اس چھوٹے سے فقرے میں جو بلاغت ہے اس کا جواب نہیں۔ چند الفاظ کے اندر حضرت یوسفؑ کی تسلی کے لیے گویا پوری داستان بیان کر دی گئی ہے کہ تمہاری جان کو خطرہ نہیں ہے‘ تم نہ صرف اس مشکل صورتِ حال سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ گے بلکہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تم اس قابل ہو گے کہ اپنے ان بھائیوں کو اُن کا یہ سلوک جتلا سکو۔

**آیت ۱۶** ﴿وَجَآءُوۡۤ اَبَاهُمۡ عِشَآءً یَّبۡكُوۡنَ ﴿۱۶﴾﴾ ’’اور وہ آئے اپنے والد کے پاس شام کو روتے ہوئے۔‘‘

**آیت ۱۷** ﴿قَالُوۡا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَتَرَكۡنَا یُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا﴾ ’’انہوں نے کہا: ابا جان! ہم جا کر دوڑ کا مقابلہ کرنے لگے اور ہم نے چھوڑ دیا تھا یوسف کو اپنے سامان کے پاس‘‘

ہم نے اپنا اضافی سامان اکٹھا کر کے ایک جگہ رکھا اور اس سامان کے پاس ہم نے یوسفؑ کو چھوڑ دیا تھا۔ خود ہم ایک دوسرے سے دوڑ میں مقابلہ کرتے ہوئے دور نکل گئے۔

﴿فَاَكَلَهُ الذِّئۡبُ ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَلَوۡ كُنَّا صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۷﴾﴾ ’’تو اُسے کھا لیا ایک بھیڑیے نے۔ اور آپؑ ہماری بات مانیں گے تو نہیں‘ خواہ ہم کتنے ہی سچے ہوں۔‘‘

**آیت ۱۸** ﴿وَجَآءُوۡ عَلٰی قَمِیۡصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ﴾ ’’اور وہ اُس کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے۔‘‘

﴿قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا ؕ﴾ ’’حضرت یعقوبؑ نے فرمایا: (واقعہ یوں نہیں) بلکہ تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا ہے۔‘‘

ان کی بات سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں‘ بات کچھ اور ہے۔ یہ بات جو تم بتا رہے ہو یہ تو تمہارے جی کی گھڑی ہوئی ایک بات ہے۔ تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے ایک بڑی بات کو ہلکا کر کے پیش کیا ہے اور تم لوگوں نے کوئی بہت بڑا غلط اقدام کیا ہے۔

﴿فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ ؕ وَاللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۸﴾﴾ ’’اب صبر ہی بہتر ہے‘ اور اللہ ہی کی مدد طلب کی جا سکتی ہے اس پر جو تم بیان کر رہے ہو۔‘‘

حضرت یعقوب علیہ السلام اکیلے تھے‘ بوڑھے تھے اور دوسری طرف دس جوان بیٹے‘ اس صورتِ حال میں اور کیا کہتے؟

**آیت ۱۹** ﴿وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ﴾ ’’اور (کچھ عرصہ بعد) ایک قافلہ آیا تو انہوں نے بھیجا اپنے آگے چلنے والے کو‘‘

جب قافلے چلتے تھے تو ایک آدمی قافلے کے آگے آگے چلتا تھا۔ وہ قافلے کے پڑاؤ کے لیے جگہ کا انتخاب کرتا اور پانی وغیرہ کے انتظام کا جائزہ لیتا۔ قافلے والوں نے اس ڈیوٹی پر مامور شخص کو بھیجا کہ وہ جا کر پانی کا کھوج لگائے۔ اس شخص نے باؤلی دیکھی تو پانی نکالنے کی تدبیر کرنے لگا۔

﴿فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ﴾ ’’تو اس نے لٹکایا اپنا ڈول۔‘‘

حضرت یوسفؑ نے اس کے ڈول کو پکڑ لیا۔ اس نے جب ڈول کھینچا اور حضرت یوسفؑ کو دیکھا تو:

﴿قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ﴾ ’’وہ پکارا تھا کہ خوشخبری ہو! یہ تو ایک لڑکا ہے۔ اور انہوں نے اسے چھپا لیا‘ ایک پونجی سمجھ کر۔‘‘

کہ بہت خوبصورت لڑکا ہے‘ بیچیں گے تو اچھے دام ملیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾﴾ ’’اور اللہ خوب جانتا تھا جو وہ کر رہے تھے۔‘‘

**آیت ۲۰** ﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾﴾ ’’اور (مصر پہنچ کر) انہوں نے بیچ دیا اس کو بڑی تھوڑی سی قیمت پر چند درہم کے عوض‘ اور وہ تھے اس کے معاملے میں بہت ہی قناعت پسند۔‘‘

اگرچہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مالِ تجارت سمجھ کر چھپایا تھا‘ مگر مصر پہنچ کر بالکل ہی معمولی قیمت پر فروخت کر دیا۔ اس زمانے میں درہم ایک دینار کا چوتھا حصہ ہوتا تھا۔ گویا انہوں نے چند چونیوں کے عوض آپؑ کو بیچ دیا۔ اس لیے کہ آپؑ کے بارے میں اُس وقت تک انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کی دو وجوہات تھیں‘ ایک تو آپؑ ان کے لیے مفت کا مال تھے جس پر ان لوگوں کا کوئی سرمایہ وغیرہ نہیں لگا تھا‘ لہٰذا جو مل گیا انہوں نے اسے غنیمت جانا۔ دوسرے ان لوگوں کو آپؑ کی طرف سے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ لڑکے کے وارث



آ کر کہیں اسے پہچان نہ لیں اور ان پر چوری کا الزام نہ لگ جائے۔ لہٰذا وہ جلد از جلد آپؑ کے معاملے سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔

## آیات ۲۱ تا ۲۹

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾

**آیت ۲۱** ﴿وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ﴾ ’’اور مصر کے جس شخص نے یوسف کو خریدا‘ (اس نے) اپنی بیوی سے کہا: اس کو اچھے طریقے سے رکھنا‘ ہو سکتا ہے یہ ہمارے لیے نفع بخش ہو یا پھر ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔‘‘

وہ شخص مصر کی حکومت میں بہت اعلیٰ منصب (عزیزِ مصر) پر فائز تھا۔ حضرت یوسفؑ کو بیٹا بنانے کی خواہش سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس کے ہاں اولاد نہیں تھی۔

﴿وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۡ﴾ ''اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو اس ملک میں تمکّن عطا کیا''

اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو اس دور کی متمدن ترین مملکت میں پہنچا دیا اور وہاں آپؑ کی رہائش کا بندوبست بھی کیا تو کسی جھونپڑی میں نہیں بلکہ ملک کے ایک بہت بڑے صاحبِ حیثیت شخص کے گھر میں‘ اور وہ بھی محض ایک غلام کے طور پر نہیں بلکہ خصوصی عزّت و اکرام کے انداز میں۔

﴿وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ﴾ ''اور تا کہ ہم اس کو سکھائیں باتوں کی تہہ تک پہنچنے کا علم۔''

یعنی عزیزِ مصر کے گھر میں آپؑ کو جگہ بنا کر دینے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہاں آپؑ کو ''معاملہ فہمی'' کی تربیت فراہم کی جائے۔ عزیزِ مصر کا گھر ایک طرح کا سیکریٹریٹ ہوگا جہاں آئے دن انتہائی اعلیٰ سطح کے اجلاس ہوتے ہوں گے‘ اور قومی و بین الاقوامی نوعیت کے انتہائی اہم امور پر بحث و تمحیص کے بعد فیصلے کیے جاتے ہوں گے اور حضرت یوسفؑ کو ان تمام سرگرمیوں کا بہت قریب سے مشاہدہ کرنے کے مواقع میسر آتے ہوں گے۔ اس طرح بہت اعلیٰ سطح کی تعلیم و تربیت کا ایک انتظام تھا جو حضرت یوسفؑ کے لیے یہاں پر کر دیا گیا۔

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ ''اور اللہ تو اپنے فیصلے پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

اللہ تعالیٰ اپنے ارادے کی تنفیذ پر غالب ہے‘ وہ اپنا کام کر کے رہتا ہے۔

**آیت ۲۲** ﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ﴾ ''اور جب آپؑ اپنی جوانی کو پہنچ گئے تو ہم نے آپؑ کو حکم اور علم عطا کیا۔''

﴿وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ ''اور اسی طرح ہم محسنین کو بدلہ دیتے ہیں۔''

حکم اور علم سے مراد نبوت ہے۔ حکم کے معنی قوتِ فیصلہ کے بھی ہیں اور اقتدار کے بھی۔ علم سے مراد علم وحی ہے۔



**آیت ۲۳** ﴿وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ﴾ ''اور آپؑ کو پھسلانے کی کوشش کی اس عورت نے جس کے گھر میں آپؑ تھے''

یعنی عزیزِ مصر کی بیوی آپؑ پر فریفتہ ہوگئی۔ قرآن میں اس کا نام مذکور نہیں‘ البتہ تورات میں اس کا نام زلیخا بتایا گیا ہے۔

﴿وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ﴾ ''اور (ایک موقع پر) اس نے دروازے بند کر لیے اور بولی جلدی سے آ جاؤ!''

﴿قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ﴾ ''آپؑ نے فرمایا: میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں‘ وہ میرا رب ہے‘ اُس نے مجھے اچھا ٹھکانہ دیا ہے۔''

یہاں پر ''ربّ'' کے دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں اللہ بھی اور آقا بھی۔ چنانچہ اس فقرے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ وہ اللہ میرا رب ہے اور اس نے میرے لیے بہت اچھے ٹھکانے کا انتظام کیا ہے‘ میں اس کی نافرمانی کا کیسے سوچ سکتا ہوں! دوسرے معنی میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کا خاوند میرا آقا ہے‘ وہ میرا محسن اور مربّی بھی ہے‘ اس نے مجھے اپنے گھر میں بہت عزت و اکرام سے رکھا ہے‘ اور میں اس کی خیانت کر کے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں‘ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا! یہ دوسرا مفہوم اس لیے بھی زیادہ مناسب ہے کہ ''رب'' کا لفظ اس سورت میں آقا اور بادشاہ کے لیے متعدد بار استعمال ہوا ہے۔

﴿اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾ ''بے شک ظالم لوگ فلاح نہیں پایا کرتے۔''

**آیت ۲۴** ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ﴾ ''اور اُس عورت نے ارادہ کیا آپؑ کا‘ اور آپؑ بھی ارادہ کر لیتے اس کا اگر نہ دیکھ لیتے اپنے رب کی ایک دلیل۔''

حضرت یوسف علیہ السلام جوان تھے اور ممکن تھا طبع بشری کی بنیاد پر آپؑ کے دل میں بھی کوئی ایسا خیال جنم لیتا‘ مگر اللہ نے اس نازک موقع پر آپؑ کی خصوصی مدد فرمائی اور اپنی خصوصی نشانی دکھا کر آپؑ کو کسی منفی خیال سے محفوظ رکھا۔ یہ نشانی کیا تھی‘ اس کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں‘ البتہ تورات میں اس کی وضاحت یوں بیان کی گئی ہے کہ عین اس موقع پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی شکل دیوار پر ظاہر ہوئی اور آپؑ نے انگلی کا اشارہ کر کے حضرت یوسفؑ کو باز رہنے کے لیے کہا۔

﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ﴾ ''یہ اس لیے کہ ہم پھیر دیں اس

سے برائی اور بے حیائی کو۔‘‘

یعنی ہم نے اپنی نشانی دکھا کر حضرت یوسفؑ سے برائی اور بے حیائی کا رخ پھیر دیا اور یوں آپؑ کی عصمت وعفت کی حفاظت کا خصوصی اہتمام کیا۔

﴿اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ﴿۲۴﴾﴾ ’’یقیناً وہ ہمارے چُنے ہوئے بندوں میں سے تھے۔‘‘

واضح رہے کہ یہاں لفظ مُخْلَص (لام کی زبر کے ساتھ) آیا ہے۔ مُخلِص اور مُخلَص کے فرق کو سمجھ لیجیے۔ مُخلِص اسم الفاعل ہے یعنی خلوص واخلاص سے کام کرنے والا اور مُخلَص وہ شخص ہے جس کو خالص کرلیا گیا ہو۔ اللہ کے مخلَص وہ ہیں جن کو اللہ نے اپنے لیے خالص کرلیا ہو یعنی اللہ کے خاص برگزیدہ اور چہیتے بندے۔

**آیت ۲۵** ﴿وَاسْتَبَقَا الْبَابَ﴾ ’’اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف دوڑے‘‘

یعنی حضرت یوسفؑ نے جب دیکھا کہ اس عورت کی نیت خراب ہے اور اس پر شیطنت کا بھوت سوار ہے تو آپؑ اس سے بچنے کے لیے دروازے کی طرف لپکے اور آپؑ کے پیچھے وہ بھی بھاگی تاکہ آپؑ کو قابو کرسکے۔

﴿وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ﴾ ’’اور پھاڑ دی اس (عورت) نے آپؑ کی قمیص پیچھے سے‘‘

آپؑ کو دوڑتے ہوئے دیکھ کر اس عورت نے آپؑ کی طرف تیزی سے لپک کر پیچھے سے آپؑ کو پکڑنے کی کوشش کی تو آپؑ کی قمیص اس کے ہاتھ میں آکر پھٹ گئی۔

﴿وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ﴾ ’’اور پایا ان دونوں نے اس کے خاوند کو دروازے کے پاس۔‘‘

اس عورت نے لازماً ایسے وقت کا انتخاب کیا ہوگا جب اس کا خاوند گھر سے باہر تھا اور اس کے جلد گھر آنے کا امکان نہیں تھا‘ مگر جونہی وہ دونوں آگے پیچھے دروازے سے باہر نکلے تو غیر متوقع طور پر اس کا خاوند عین دروازے پر کھڑا تھا۔

﴿قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴿۲۵﴾﴾

’’وہ (فوراً) بولی کیا سزا ہونی چاہیے ایسے شخص کی جس نے ارادہ کیا تمہاری بیوی کے ساتھ برائی کا‘ سوائے اس کے کہ اسے جیل بھیج دیا جائے یا کوئی اور دردناک سزا دی جائے!‘‘



اپنے خاوند کو دیکھتے ہی اس عورت نے فوراً پینترا بدلا اور اس کی غیرت کو للکارتے ہوئے بولی کہ اس لڑکے نے مجھ پر دست درازی کی ہے اور میں نے بڑی مشکل سے خود کو بچایا ہے۔ اب اس سے آپ ہی سمجھیں اور اسے کوئی عبرت ناک سزا دیں۔

**آیت ۲۶** ﴿قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ﴾ ’’آپؑ نے فرمایا کہ اسی نے مجھے پھسلانا چاہا تھا‘‘

صورتِ حال بہت نازک اور خطرناک رخ اختیار کرچکی تھی۔ حضرت یوسفؑ کو بھی اپنے دفاع میں کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ لہٰذا آپؑ نے صاف صاف بتا دیا کہ خود اس عورت نے مجھے گناہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ﴾ ’’اور گواہی دی عورت کے خاندان والوں میں سے ایک گواہ نے۔‘‘

اس عورت کے اپنے رشتہ داروں میں سے بھی کوئی شخص موقع پر آ پہنچا۔ اس نے موقع محل دیکھ کر وقوعہ کے بارے میں بڑی مدلل اور خوبصورت قرائنی شہادت (circumstancial evidence) دی کہ:

﴿اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ﴿۲۶﴾﴾ ’’اگر تو اس کی قمیص پھٹی ہے سامنے سے‘ تو یہ سچی ہے اور وہ جھوٹا ہے۔‘‘

اگر عورت سے دست درازی کی کوشش ہو رہی تھی اور وہ اپنا تحفظ کر رہی تھی تو ظاہر ہے کہ حملہ آور کی قمیص سامنے سے پھٹنی چاہیے۔

**آیت ۲۷** ﴿وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴿۲۷﴾﴾ ’’اور اگر اس کی قمیص پھٹی ہے پیچھے سے‘ تو پھر یہ جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے۔‘‘

اس عادلانہ اور حکیمانہ گواہی سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اس معاشرے میں بہت سی خرابیاں تھیں (جن میں سے کچھ کا ذکر آگے آئے گا) وہاں اس گواہی دینے والے شخص جیسے حق گو اور انصاف پسند لوگ بھی موجود تھے جس نے قرابت دار ہوتے ہوئے بھی حق اور انصاف کی بات کی۔

**آیت ۲۸** ﴿فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ﴿۲۸﴾﴾

''پھر جب اس (عزیزِ مصر) نے دیکھا کہ آپؑ کی قمیص پھٹی ہوئی ہے پیچھے سے' تو اس نے کہا کہ یہ تم عورتوں کی چالوں میں سے (ایک چال) ہے' یقیناً تم عورتوں کے فریب بہت بڑے ہوتے ہیں۔''

پھر عزیزِ مصر نے حضرت یوسفؑ سے کہا:

**آیت ۲۹** ﴿یُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ ہٰذَا﴾ ''یوسف! اس معاملے سے درگزر کرو۔''

اس کے بعد وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوا اور بولا:

﴿وَ اسۡتَغۡفِرِیۡ لِذَنۡۢبِکِ ۚۖ اِنَّکِ کُنۡتِ مِنَ الۡخٰطِـِٕیۡنَ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور تم اپنے گناہ کی معافی مانگو' یقیناً قصوروار تم ہی ہو۔''

## آیات ۳۰ تا ۳۵

وَقَالَ نِسۡوَۃٌ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ امۡرَاَتُ الۡعَزِیۡزِ تُرَاوِدُ فَتٰىہَا عَنۡ نَّفۡسِہٖ ۚ قَدۡ شَغَفَہَا
حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىہَا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتۡ بِمَکۡرِہِنَّ اَرۡسَلَتۡ اِلَیۡہِنَّ
وَاَعۡتَدَتۡ لَہُنَّ مُتَّکَاً وَّ اٰتَتۡ کُلَّ وَاحِدَۃٍ مِّنۡہُنَّ سِکِّیۡنًا وَّ قَالَتِ اخۡرُجۡ
عَلَیۡہِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَیۡنَہٗۤ اَکۡبَرۡنَہٗ وَ قَطَّعۡنَ اَیۡدِیَہُنَّ وَ قُلۡنَ حَاشَ لِلّٰہِ مَا ہٰذَا
بَشَرًا ؕ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا مَلَکٌ کَرِیۡمٌ ﴿۳۱﴾ قَالَتۡ فَذٰلِکُنَّ الَّذِیۡ لُمۡتُنَّنِیۡ فِیۡہِ ؕ
وَ لَقَدۡ رَاوَدۡتُّہٗ عَنۡ نَّفۡسِہٖ فَاسۡتَعۡصَمَ ؕ وَ لَئِنۡ لَّمۡ یَفۡعَلۡ مَاۤ اٰمُرُہٗ لَیُسۡجَنَنَّ
وَ لَیَکُوۡنًا مِّنَ الصّٰغِرِیۡنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ ۚ
وَ اِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ کَیۡدَہُنَّ اَصۡبُ اِلَیۡہِنَّ وَ اَکُنۡ مِّنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿۳۳﴾
فَاسۡتَجَابَ لَہٗ رَبُّہٗ فَصَرَفَ عَنۡہُ کَیۡدَہُنَّ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۳۴﴾ ثُمَّ
بَدَا لَہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا رَاَوُا الۡاٰیٰتِ لَیَسۡجُنُنَّہٗ حَتّٰی حِیۡنٍ ﴿۳۵﴾

**آیت ۳۰** ﴿وَ قَالَ نِسۡوَۃٌ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ امۡرَاَتُ الۡعَزِیۡزِ تُرَاوِدُ فَتٰىہَا عَنۡ نَّفۡسِہٖ ۚ﴾
''اور شہر میں عورتوں نے (اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے) کہا کہ عزیز کی بیوی تو اپنے



غلام کو پھسلا رہی ہے۔''

﴿قَدۡ شَغَفَہَا حُبًّا ؕ﴾ ''وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔''

﴿اِنَّا لَنَرٰىہَا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳۰﴾﴾ ''یقیناً ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بہت بھٹک گئی ہے۔''

اس کا اپنے غلام کے ساتھ اس طرح کا معاملہ! یہ تو بہت ہی گھٹیا بات ہے!

**آیت ۳۱** ﴿فَلَمَّا سَمِعَتۡ بِمَکۡرِہِنَّ﴾ ''پھر جب اُس نے سنیں ان کی مکارانہ باتیں''

عزیزِ مصر کی بیوی نے جب سنا کہ شہر میں اس کے خلاف اس طرح کے چرچے ہو رہے ہیں اور مصر کی عورتیں ایسی طعن آمیز باتیں کر رہی ہیں تو اس نے بھی جوابی کارروائی کا منصوبہ بنا لیا۔ یہ اس معاشرے کے انتہائی اعلیٰ سطح کے لوگوں کی بات تھی اور اس کا چرچا بھی اسی سطح پر ہو رہا تھا۔ اُسے بھی اپنے اردگرد سب لوگوں کے کردار کا پتا تھا' کہاں کیا خرابی ہے اور کس کے ہاں کتنی گندگی ہے وہ سب جانتی تھی۔ چنانچہ اس نے اس اعلیٰ سوسائٹی کے اجتماعی کردار کا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

﴿اَرۡسَلَتۡ اِلَیۡہِنَّ وَ اَعۡتَدَتۡ لَہُنَّ مُتَّکَاً﴾ ''اُس نے دعوت دی اُن سب کو اور اہتمام کیا ایک تکیہ دار مجلس کا''

اُس نے کھانے کی ایک پُرتکلف تقریب کا اہتمام کیا جس میں مہمان عورتوں کے لیے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔

﴿وَّ اٰتَتۡ کُلَّ وَاحِدَۃٍ مِّنۡہُنَّ سِکِّیۡنًا﴾ ''اور ان میں سے ہر عورت کو اُس نے ایک چھری دے دی''

کھانے کی چیزوں میں پھل وغیرہ بھی ہوں گے' چنانچہ ہر مہمان عورت کے سامنے ایک ایک چھری بھی رکھ دی گئی۔

﴿وَّ قَالَتِ اخۡرُجۡ عَلَیۡہِنَّ ۚ﴾ ''اور (یوسفؑ سے) کہا کہ اب تم ان کے سامنے آؤ!''

﴿فَلَمَّا رَاَیۡنَہٗۤ اَکۡبَرۡنَہٗ﴾ ''پھر جب انہوں نے یوسفؑ کو دیکھا تو اسے بہت عظیم جانا (ششدر رہ گئیں)''

﴿وَ قَطَّعۡنَ اَیۡدِیَہُنَّ﴾ ''اور ان سب نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے''

عورتوں نے جب پاکیزگی اور تقدس کا پیکر ایک جوانِ رعنا اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو

مبہوت ہو کر رہ گئیں۔ سب کی سب آپؑ کے حسن و جمال پر ایسی فریفتہ ہوئیں کہ اپنے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے۔ ممکن ہے کسی ایک عورت کا ہاتھ تو واقعی عالمِ حیرت و محویت میں کٹ گیا ہو اور اس کی طرف حضرت یوسفؑ بحیثیت خادم کے متوجہ ہوئے ہوں کہ خون صاف کر کے پٹی وغیرہ کر دیں اور یہ دیکھ کر باقی سب نے بھی اپنی اپنی انگلیاں دانستہ کاٹ لی ہوں کہ اس طرح یہی التفات انہیں بھی ملے گا۔ قَطَّعَ بابِ تفعیل ہے' جس میں کسی کام کو پورے اہتمام اور ارادے سے کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔

﴿وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾﴾ ''اور وہ پکار اٹھیں کہ حاشاللہ یہ کوئی آدمی تو نہیں! یہ تو کوئی بہت بزرگ فرشتہ ہے۔''

آیت ۳۲ ﴿قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ﴾ ''تو اس عورت نے کہا کہ یہ ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کر رہی تھیں۔''

﴿وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ﴾ ''اور یقیناً میں نے اسے پھسلانا چاہا تھا لیکن وہ بچا رہا۔''

﴿وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾﴾ ''اور اگر اس نے وہ نہ کیا جو میں اسے حکم دے رہی ہوں تو وہ لازماً قید میں پڑے گا اور ضرور ذلیل ہو کر رہے گا۔''

اس عورت کا دھڑلے سے خصوصی دعوت کا اہتمام کرنا اور اس میں سب کو فخر سے بتانا کہ دیکھ لو یہ ہے وہ شخص جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں' اور پھر پوری بے حیائی سے اعلان کرنا کہ ایک دفعہ تو یہ مجھ سے بچ گیا ہے مگر کب تک؟ آخر کار اسے میری بات ماننا ہوگی! اس سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ ان کی اس انتہائی اونچی سطح کی سوسائٹی کی مجموعی طور پر اخلاقی حالت کیا تھی!

آیت ۳۳ ﴿قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ ۚ﴾ ''یوسفؑ نے دعا کی: اے میرے پروردگار! مجھے قید زیادہ پسند ہے اُس چیز سے جس کی طرف یہ مجھے بلا رہی ہیں۔''

﴿وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾﴾ ''اور اگر تو نے مجھ سے دور نہ کر دیا ان کی چالوں کو تو (ہو سکتا ہے) میں بھی ان کی طرف مائل ہو جاؤں اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔''

آیت ۳۴ ﴿فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾﴾ ''تو آپؑ کے رب نے آپؑ کی دعا قبول کر لی اور اُن عورتوں کی چالوں کو آپؑ سے پھیر دیا۔ یقیناً وہی ہے سننے والا' جاننے والا۔''

آیت ۳۵ ﴿ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾﴾ ''پھر اُن لوگوں کو یہ بات سوجھی ساری نشانیاں دیکھ لینے کے بعد کہ اس کو کچھ عرصہ کے لیے جیل میں ڈال دیا جائے۔''

اس تقریب میں جو کچھ ہوا اس معاملے کو پوشیدہ رکھنا ممکن نہیں تھا' چنانچہ اربابِ اختیار نے جب یہ سارے حالات دیکھے تو انہیں عافیت اور مصلحت اسی میں نظر آئی کہ حضرت یوسفؑ کو وقتی طور پر منظر سے ہٹا دیا جائے اور اس کے لیے مناسب یہی ہے کہ کچھ عرصے کے لیے انہیں جیل میں ڈال دیا جائے۔

❁❁❁


دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 45 روپے    اشاعت عام: 25 روپے

# وحدتِ اَدیان کا باطل تصوّر

## سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۲ کی آڑ میں

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

**اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ** ﴿۶۲﴾ (البقرۃ)

### تمہید

قرآن حکیم کے بالکل آغاز میں مکی اور مدنی سورتوں کا جو پہلا گروپ ہے اس میں مکی سورت صرف سورۃ الفاتحہ ہے‘ جو اگرچہ قامت میں تو بہت مختصر ہے لیکن قیمت میں بہت گراں قدر ہے۔ اس کے بعد چار سورتیں مدنی ہیں‘ ان میں پہلی سورۃ البقرۃ ہے جو قرآن حکیم کی طویل ترین سورتوں میں سے ایک ہے۔ اس میں دو مضامین کی لڑیاں تسلسل کے ساتھ چلتی ہیں۔ ایک تو اہلِ کتاب یعنی یہود ونصاریٰ دونوں پر اتمامِ حجت‘ اس لیے کہ مکی قرآن میں اصل مخاطب مشرکینِ عرب تھے اور ان پر دعوت کا حق ادا کر کے ہر طرح سے اتمامِ حجت ہو چکا تھا۔ اگرچہ مکی دَور کے آخری حصہ میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں اہلِ کتاب کی طرف بھی حوالہ تھا‘ چنانچہ سورۃ الاعراف میں نمایاں طور پر روئے سخن اہلِ کتاب کی طرف ہے‘ لیکن ان سے اصل خطاب نبی اکرم ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد شروع ہوا ہے۔ لہٰذا ان چار سورتوں (البقرۃ تا المائدۃ) کا مسلسل ایک مضمون ہے‘ یعنی اہلِ کتاب کو دعوت‘ ان پر اتمامِ حجت اور ساتھ ہی ملامت۔ اللہ کے دین اور اس کی عطا کردہ نعمت کے ساتھ ان کا جو طرزِ عمل رہا‘ اس کی بنا پر ان پر فردِ جرم عائد کی گئی ہے۔



سورۃ البقرۃ میں جو دوسرا مضمون تسلسل کے ساتھ چلتا ہے‘ جس کا نقطۂ آغاز سورۃ البقرۃ اور نقطۂ عروج سورۃ المائدۃ ہے‘ وہ شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔ مکی سورتوں میں ایمان کے مضامین بیان ہوئے ہیں یا پھر انبیاء و رُسل ﷺ کے حالات جو بہت ہی تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ ان میں بنیادی انسانی اخلاقیات کا مضمون بھی آیا ہے‘ لیکن شرعی احکامات اصلاً مدینہ منورہ ہی میں آئے ہیں جہاں ان کی تنفیذ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ سے ان کا آغاز ہوا اور سورۃ المائدۃ میں تکمیل ہوئی۔

اب سورۃ البقرۃ جو ہمارے زیر مطالعہ ہے‘ اس کے بارے میں چند باتیں نوٹ کر لیں۔ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے ہجرت کے بعد نازل ہونے والی یہ پہلی سورۃ ہے‘ اگرچہ اس کا نزول اس طور سے نہیں ہوا ہے کہ پوری سورۃ ایک بار نازل ہو گئی ہو۔ حجم کے لحاظ سے یہ قرآن مجید کی عظیم ترین سورۃ ہے اور اس کی عظمت صرف حجم کے لحاظ سے ہی نہیں‘ بعض دیگر اعتبارات سے بھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ ؓ نے حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمانِ مبارک نقل کیا ہے‘ جسے جامع ترمذی میں روایت کیا گیا ہے کہ ”ہر شے کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن حکیم کی چوٹی سورۃ البقرۃ ہے“۔ یہ سورۂ مبارکہ وقفے وقفے سے تھوڑی تھوڑی آیات کی شکل میں ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر کے متصلاً قبل تک نازل ہوئی۔ اگرچہ غزوۂ بدر سے قبل سورۃ البقرۃ کے علاوہ سورۂ محمد (ﷺ) بھی نازل ہوئی ہے‘ جس کا دوسرا نام سورۃ القتال ہے‘ لیکن اکثر و بیشتر وہ آیات جو ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر تک نازل ہوئی ہیں‘ اس سورۂ مبارکہ میں جمع کی گئی ہیں‘ اگرچہ چند ایک مستثنیات ہیں۔ سود یعنی ربا سے متعلق آخری آیات سن ۹ ہجری میں نازل ہوئی تھیں لیکن انہیں اس سورۃ میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس سورۂ مبارکہ کی آخری دو آیات زمین پر نہیں بلکہ معراج میں اُمت کے لیے تحفہ کے طور پر عطا ہوئی ہیں۔

اس سورۃ کے مضامین کے تجزیہ کے ضمن میں مَیں نے اسے ”سُورَةُ الْاُمَّتَیْن“ کا نام دیا ہے‘ یعنی یہ دو اُمتوں کی سورۃ ہے‘ اس میں سابقہ اُمت بنی اسرائیل اور موجودہ اُمت مسلمہ‘ دونوں سے خطاب ہے۔ چنانچہ نمایاں طور پر اس کے دو حصے ہیں‘ جو تقریباً مساوی ہیں‘ گو آیات کی تعداد میں قدرے فرق ہے۔ پہلے حصے میں ۱۵۲ آیات اور ۱۸ رکوع ہیں جبکہ دوسرے حصے میں ۱۳۴ آیات اور ۲۲ رکوع ہیں۔ گویا پہلا حصہ آیات کے اعتبار سے بھاری ہے

جبکہ نصف ثانی میں رکوعوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ سورۃ تقریباً دو برابر حصوں میں منقسم ہے۔ سورۃ الفاتحہ کے بارے میں تو ایک حدیثِ قدسی کی رو سے اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ (( قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ ))[1] ''میں نے نماز (مراد سورۃ الفاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو برابر حصوں میں تقسیم کر لیا ہے''۔ اسی کا عکس یا پرتو سورۃ البقرۃ ہے جو سورۃ الفاتحہ کے فوراً بعد شروع ہو رہی ہے اور اسے بھی اللہ نے دو برابر برابر حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے حصہ میں اصل روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہے' جبکہ دوسرے حصہ میں تمام تر خطاب اُمتِ محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے ہے۔ اس کی مزید تقسیم کے بارے میں میں ''قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ'' نامی کتاب میں لکھ بھی چکا ہوں' یعنی پہلے حصہ میں ایک عمودی تقسیم ہے کہ پہلے ۴' پھر ۱۰ اور اس کے بعد پھر ۴' کل ۱۸ رکوع۔ اور چار ہی مضامین کی لڑیاں نصف ثانی میں چلتی ہیں جو آپس میں بٹی ہوئی ہیں۔ یہ گویا افقی (horizontal) تقسیم ہو گی۔ یعنی ایک تو شریعت کے احکام جو اوّلاً عقائد و ایمانیات اور ثانیاً عبادات و معاملات اور اوامر و نواہی وغیرہ پر مشتمل ہیں' دوسرے اللہ کی راہ میں جہاد جس کی دو شاخیں جہاد بالمال یعنی انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد بالنفس یعنی قتال فی سبیل اللہ ہیں۔ یہ چار لڑیاں ہیں جو نصف ثانی میں چلتی ہیں اور آپس میں بٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہاں آپ ان مضامین کو رکوعوں میں تقسیم نہیں کر سکتے' کیونکہ یہ لڑیاں مسلسل چلتی ہیں' مگر آپس میں بٹی ہونے کی وجہ سے پہلے ایک مضمون آئے گا' پھر دوسرا' تیسرا' چوتھا اور پھر پہلا۔ جیسے چار مختلف رنگ کی ڈوریاں ہوں' انہیں اگر رسّی کی شکل میں بٹ دیا جائے تو ایک طرف سے دیکھنے پر چاروں رنگ کٹے پھٹے نظر آئیں گے لیکن رسّی کو کھول دیا جائے تو ہر ڈوری مسلسل نظر آئے گی۔ اس طرح چار مضامین کی ڈوریاں اگرچہ اپنی جگہ مسلسل ہیں لیکن چونکہ انہیں بٹ دیا گیا ہے' اس لیے ان میں تسلسل دکھائی نہیں دیتا' حالانکہ معنوی تسلسل موجود ہے۔

جہاں تک پہلے حصہ کا تعلق ہے اس کے پہلے چار رکوع تمہیدی اور آخری چار رکوع تحویلی ہیں' جبکہ درمیان کے دَس رکوعوں میں براہِ راست بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ پہلے چار رکوعوں میں سے ابتدائی دو رکوعوں میں تین قسم کے انسانوں کی تقسیم ہے' یعنی وہ جنہوں نے

(۱) صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ ...... الخ



قرآن حکیم سے صحیح استفادہ کیا' اس پر ایمان لائے' اس سے انہوں نے اپنے قلوب و اذہان کو بھی منور کیا اور اپنے سیرت و کردار کو بھی مزیّن کیا۔ دوسرے وہ جو تکبّر' ضد اور حسد کی بنا پر اس کے انکار اور کفر پر اَڑ گئے اور تیسرے وہ جو بین بین رہے اور جن کی زیادہ تفصیل دوسرے رکوع میں آئی ہے' اس لیے کہ یہ تیسرا طبقہ ہی تھا جو ہجرت کے بعد مدینہ میں نمایاں طور پر سامنے آیا' مکہ مکرمہ میں یہ تیسرا طبقہ موجود نہیں تھا' اگر تھا بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ بعد کے دو رکوعوں میں قرآن کی دعوت اور قرآن کا بنیادی فلسفہ بیان ہوا ہے' گویا کلی قرآن کا لُبِّ لُباب ہے جو سورۃ البقرہ کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں ہے۔ دعوت کے اعتبار سے تیسرا اور فلسفہ و حکمت کے اعتبار سے چوتھا رکوع اہم ہے۔ یہ چاروں رکوع تمہیدی ہیں۔

اس کے بعد بنی اسرائیل سے خطاب شروع ہوتا ہے۔ ان دس رکوعوں میں جو تقسیم ہے وہ بعد میں بیان کی جائے گی۔ ان کے بعد چار رکوع تحویلی ہیں' یعنی جن میں تحویلِ قبلہ کا حکم ہے' اور تحویلِ قبلہ دراصل اس بات کی علامت تھی کہ سابقہ اُمّتِ مسلمہ کو' جس کا مرکز یروشلم رہا' معزول کر کے اب ایک نئی اُمّت' اُمتِ محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی تاسیس ہوئی ہے' جس کا مرکز بیت اللہ ہے۔ گویا سابقہ اُمتِ مسلمہ بنی اسرائیل کو' جسے دو ہزار سال تک اللہ کی نمائندہ اُمت ہونے کا شرف حاصل رہا' اب اس منصب سے معزول کیا جا رہا ہے' اور ایک نئی اُمت' جو محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے' اب اسے اس روئے ارضی پر اس مقام پر فائز کیا جا رہا ہے اور یہ مقام اسے اب تا قیامِ قیامت حاصل رہے گا۔

سورۃ البقرہ کے پندرہویں اور سولہویں رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو نمایاں کیا گیا ہے' اس لیے کہ خانۂ کعبہ جسے اس نئی اُمت کا مرکز بنایا جا رہا ہے' کی تعمیر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے کی تھی۔ ان کے بعد ۱۷ اور ۱۸' دو رکوع تحویلِ قبلہ سے متعلق ہیں۔

اب درمیان کے دس رکوع (۵ تا ۱۴) جن میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے' ان میں جو اہم نکتہ ہے اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس حصہ کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر لیں۔ پہلے (پانچویں) رکوع کی ۷ آیات بنی اسرائیل کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی پُرزور دعوت پر مشتمل ہیں۔ بنی اسرائیل سے خطاب کے ذیل میں یہ سات آیات گویا بمنزلہ ''فاتحہ'' کے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ کی بھی سات آیات ہیں' اسی طرح بنی اسرائیل کو دعوت کے ضمن میں یہ سات آیات بہت ہی اہم ہیں۔ اس کے بعد بقیہ ۹ رکوعوں (۶ تا ۱۴) کے شروع اور اختتام پر بھی دو

دو آیات بالکل انہی معنوں میں ہیں۔ چھٹے رکوع اور پھر پندرہویں رکوع کی پہلی آیت کا آغاز انہی الفاظ میں ہوا ہے جو پانچویں رکوع کے آغاز میں آئے ہیں‘ یعنی ﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ﴾

چھٹے رکوع کی پہلی دو آیات اور پندرہویں رکوع کی پہلی دو آیات گویا ریاضی کے بریکٹس کے مانند ہیں اور اس طرح یہ ۹ رکوع بریکٹس کے اندر شمار ہوں گے۔ بریکٹس کے اندر کا تمام تر حصہ بنی اسرائیل کی ملامت پر مشتمل ہے‘ جس میں ان کے جرائم اور ان پر عائد فردِ جرم کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ ریاضی کے اصول کی رو سے بریکٹس کے اندر کے ۹ رکوع (۶ تا ۱۴) شروع کے رکوع نمبر ۵ کی سات آیات کے تابع تصور ہوں گے۔ یہ باتیں یہاں اس لیے دہرائی جا رہی ہیں تاکہ زیر بحث آیات کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

ایک بات مزید نوٹ کر لیجیے کہ اس سے قبل ہم چھٹے اور ساتویں رکوع کا مطالعہ مکمل کر چکے ہیں‘ جن میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے بہت سے واقعات کا تذکرہ ہوا ہے اور ان کے طرزِ عمل کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان دو رکوعوں میں ایک اعتبار سے مضمون مکمل ہو گیا ہے‘ اس لیے کہ چھٹا رکوع شروع ہو رہا ہے ﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ﴾ کے الفاظ سے اور ساتواں رکوع ختم ہو رہا ہے ان الفاظ پر: ﴿وَضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ وَالۡمَسۡکَنَۃُ......﴾ (الآیۃ)۔ چنانچہ یہاں کوئی عقیدہ والی بات نہیں آئی ہے۔ البتہ اب ہم جس حصہ کا آغاز کر رہے ہیں اس میں فکری اور نظریاتی باتیں بھی شامل ہیں‘ یعنی حالات و واقعات کا تجزیہ اور ان کی تہہ میں جو فکری اور نظریاتی غلطیاں کارفرما تھیں‘ اور ان کے عقائد میں جو کجی پیدا ہو گئی تھی اس کا بیان ہے‘ اور یہ حصہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں حکمت قرآنی کے بہت بڑے خزانوں پر مشتمل بہت قیمتی آیات شامل ہیں۔ اور یہ درحقیقت موجودہ اُمّتِ مُسلمہ کے لیے بھی ایک پیشگی تنبیہہ ہے کہ سابقہ اُمّتِ مُسلمہ جن غلط نظریات‘ عقائد‘ خیالات اور طرزِ عمل کی بنا پر اس انجامِ بد کو پہنچی ہے تم بھی کہیں اسی کو اختیار نہ کر لینا‘ کیونکہ ظاہر ہے غلط اعمال و افعال‘ غلط عقائد و نظریات کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسانی شخصیت کے یہ دو پہلو ہیں‘ ایک عقائد و نظریات اور دوسرے اعمال و افعال‘ جن کے درمیان گہرا رشتہ ہے۔ اگر کسی شخص سے غلط اعمال سرزد ہوتے ہیں تو یقیناً ان کے پیچھے اس شخص کے غلط افکار و نظریات ہیں۔ تو ان حصوں میں آپ دیکھیں گے کہ نہ صرف واقعاتی طور پر تجزیہ کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی تہہ میں



جو فکری گمراہی ہے اس کی نشاندہی بھی کی جا رہی ہے۔ یہ گویا ایک عالمی سچائی اور ابدی حقیقت ہے جو بتائی جا رہی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں جو متفق علیہ ہے‘ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا تھا کہ اے مسلمانو! تمہارے اندر بھی وہ خرابیاں پیدا ہوں گی جو پہلی اُمّتوں میں پیدا ہوئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ ، حَتّٰى لَوْ سَلَكُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَسَلَكْتُمُوْهُ)) قُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ: ((فَمَنْ!))

’’اے مسلمانو! تم بھی لازماً اتباع کرو گے انہی لوگوں کے طریقہ کا جو تم سے پہلے تھے‘ بالشت کے ساتھ بالشت اور ہاتھ کے ساتھ ہاتھ (جیسا کہ محاورہ ہے کہ تم انہی کے نقش قدم پر چلو گے) حتیٰ کہ وہ اگر کسی گوہ کے بل میں گھسے تھے تو تم بھی گھسو گے‘‘۔ صحابیؓ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: ’’یا رسول اللہ! کیا یہود و نصاریٰ؟‘‘ (یعنی کیا آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں کہ ان کے اندر جو اعتقادی اور عملی خرابیاں تھیں وہ ہمارے اندر بھی آ جائیں گی؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اور کون؟‘‘

گویا یہ ایک پیشگی تنبیہہ تو ہے ہی‘ ستم ظریفی کہیے کہ واقعہ بھی یہی ہے کہ وہی نظری و اعتقادی گمراہیاں‘ وہی عملی خرابیاں‘ جو وہاں تھیں‘ یہاں بھی آئی ہیں۔ بہرحال جہاں تک تنبیہہ اور نشاندہی کا تعلق ہے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔

## آیتِ قرآنی سے غلط استدلال

اس تمہید کے بعد اب ہم اس حصہ کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ ہَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾﴾

سورۃ البقرۃ کے آٹھویں رکوع کی اس پہلی آیت کو خاصی controversial اور مغالطہ آمیز بنا دیا گیا ہے۔ پہلے بھی جب کبھی اس طرح کا فتنہ اٹھا ہو گا تو اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہو گا۔ آیت زیر مطالعہ اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۹ کے حوالہ سے ایک بہت بڑا فتنہ ’’وحدتِ ادیان‘‘ کھڑا کیا گیا تھا۔

فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ ’’یقیناً وہ لوگ جو مسلمان بنے۔‘‘ میں نے یہاں ’’جو ایمان

لائے'' ترجمہ نہیں کیا' اس لیے کہ اہلِ ایمان سے مراد مسلمان ہیں' چاہے وہ حقیقت میں مؤمن ہوں یا منافق۔ جو صرف قانونی مسلمان ہوتے ہیں قرآن ان سے بھی ''اے ایمان والو'' کہہ کر خطاب کرتا ہے' اس لیے کہ قانونی ایمان تو انہیں بہرحال حاصل ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ ملاحظہ ہو:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَالۡکِتٰبِ الَّذِیۡ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوۡلِهٖ وَالۡکِتٰبِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ﴾

''اے ایمان کے دعوے دارو! ایمان لاؤ (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اللہ پر' اللہ کے رسولوں پر' اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے بندے (ﷺ) پر نازل کی اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے پہلے نازل کی۔''

تو آیت زیر مطالعہ کا ترجمہ یوں ہوگا:

''یقیناً جو لوگ مسلمان ہوئے' اور وہ جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی' جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور جس نے بھی نیک عمل کیے' تو اُن کا اجر ان کے ربّ کے پاس محفوظ ہے' نہ ان کے لیے کوئی خوف ہے اور نہ وہ کسی حزن سے دوچار ہوں گے۔''

یہ اس آیۂ مبارکہ کا لفظی ترجمہ ہوا۔ یہ بات کئی دفعہ واضح کی جا چکی ہے کہ اہم مضامین قرآن حکیم میں کم از کم دو بار ضرور آتے ہیں' لہٰذا اس آیت کی ہم معنی آیت سورۃ المائدۃ کی آیت ٦٩ ہے جس کے الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو سورۃ البقرۃ کی مذکورہ بالا آیت کے ہیں' البتہ ترتیب میں معمولی سی تبدیلی ہے۔ سورۃ البقرہ میں نصاریٰ پہلے اور صابی بعد میں ہے' وہاں صابی پہلے اور نصاریٰ بعد میں ہے' باقی الفاظ جوں کے توں یہی ہیں۔

اگر قرآن حکیم میں سیاق وسباق اور دیگر مقامات پر جو باتیں آئی ہیں ان سب کو نظر انداز کر دیا جائے اور صرف کسی ایک مقام یا آیت کو توجہ کا مرکز بنا کر اس سے اپنا ایک فلسفہ اخذ کرنے کی کوشش کی جائے تو ان الفاظ سے یہ مغالطہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص خواہ یہودی ہو' نصرانی ہو' صابی ہو' چاہے مسلمان ہو' جو کوئی بھی ایمان رکھتا ہو اللہ پر' یومِ آخر پر اور نیک عمل کرتا ہو تو اس کی نجات یقینی ہے۔ یعنی اس آیت کی رو سے رسالت پر ایمان لازم نہیں آتا۔ گویا محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا نجات کے لیے شرطِ لازم نہیں۔ اسے ''وحدتِ ادیان'' کا نام دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے نبوت ورسالت پر ایمان سے جو فرق آتا ہے وہ شریعت کا ہے۔ شریعتِ موسوی



حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے متعلق ہے' شریعتِ محمدی کا محمد ﷺ پر ایمان لانے پر انحصار ہے۔ چنانچہ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شریعت بھی غیر ضروری ہے' اللہ پر اور آخرت پر ایمان اور نیک عمل نجات کے لیے کافی ہے! کوئی شخص نماز پڑھتا ہے یا نہیں پڑھتا' کیسے پڑھتا ہے وغیرہ' یہ ثانوی چیزیں ہیں' نجات کے لیے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں!

یہ فتنہ ہمارے ہاں تین حوالوں سے آیا ہے۔ اوّلاً: تصوف میں ہمہ اوست کا تصور۔ اگر یہ اصل شکل میں ہو تو پھر کسی مذہب' شریعت یا عبادت کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ جیسا کہ مشہور مصرعہ ہے: ''مسجد' مندر ہکِّو نور''۔ یعنی مسجد اور مندر میں ایک ہی نور ہے۔ گویا جو بُتوں کو پوجتے ہیں وہ بھی اسی ہستیٔ باری تعالیٰ کو پُوجنے والے ہیں' بت تو محض ایک ذریعہ ہیں' اپنی توجہ مرتکز رکھنے کے لیے بُتوں کو ذریعہ بنایا گیا ہے' ورنہ پوجا تو کسی اور ہستی یا ہستیوں کی کی جاتی ہے۔

ثانیاً: اکبرِ اعظم کا ''دینِ الٰہی'' کا فتنہ۔ یہ دونوں فتنے خاص طور پر ہندوستان میں ایک ہی وقت میں اُبھرے ہیں۔ اکبر اگرچہ اَن پڑھ تھا' مگر نہایت ذہین انسان تھا' اسے یہ محسوس ہوگیا تھا کہ مختلف مذاہب اور قومیتوں کی ہندوستان میں یہ جو کھچڑی پکی ہوئی ہے یہ اس کی عظمت اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے' لوگوں میں یکجہتی نہیں ہے اور وہ ایک قوم نہیں بن پاتے' لہٰذا ان مذاہب کے ظاہری فرق وتفاوت کو ختم کر کے ایک ہی مذہب بنا دیا جائے' تاکہ آپس کی کھٹ پٹ کم ہو اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان ایک عظیم ملک کی شکل اختیار کر سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اس نے ''دین الٰہی'' ایجاد کیا' جس کے لیے اُس نے قرآن حکیم کا بھی سہارا لیا۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے علماء اسے یہ پٹی پڑھانے کے لیے موجود تھے۔

قرآن مجید میں دو جگہ یہ مضمون آیا ہے (سورۃ السجدہ اور سورۃ الحج میں) کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تدبیر کائنات ہو رہی ہے' اس میں ہمارا ایک ہزار سال اللہ کے ایک دن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکبر کا کہنا تھا کہ اب دین محمدیؐ کو ایک ہزار سال پورے ہو گئے ہیں' محمد ﷺ کا لایا ہوا دین ایک ہزار سال کے لیے تھا' لہٰذا اب وہ ختم ہوگیا اور اگلے ہزار سال کے لیے میرے ایجاد کردہ دینِ الٰہی پر عمل کیا جائے۔ اسی حوالے سے اسے ''الفِ ثانی'' یعنی دوسرا ہزار سالہ دَور کا نام دیا گیا۔ یہ واقعتاً بہت زبردست فتنہ تھا' لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنے دین کی حفاظت کی ذمہ داری لے رکھی ہے' یہ آخری دین ہے' اب کوئی نبی تو آئے گا نہیں' البتہ مجدّدین کا سلسلہ جاری ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ سے ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی کا کام لیا۔ اسی لیے انہیں ''مجددِ الفِ ثانی'' کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے جداگانہ

تشخص‘ شریعت کی اہمیت اور اتباعِ سنت کا مقام اجاگر کرنا حضرت مجدد الف ثانیؒ کا بہت بڑا کارنامہ ہے‘ جس کا یہ نتیجہ تھا کہ اکبر کی موت کے ساتھ ہی دینِ الٰہی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

یہ فتنہ گزشتہ صدی میں ہندو مفکرین نے دوبارہ وحدتِ ادیان کے نام سے اٹھایا۔ اس کے لیے برہمو سماج کا تصور پیش کیا گیا‘ جسے گاندھی نے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور ہندوستان میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی تاکہ ایک متحدہ ہندوستانی قوم وجود میں آئے۔ موجودہ دور میں یہ فتنہ سیکولرزم کی شکل میں پیش کیا گیا ہے‘ یعنی یہ تصور کہ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے‘ اجتماعی نظام میں اس کا عمل دخل نہیں ہونا چاہیے‘ ہر ایک کو یہ آزادی حاصل ہے کہ جس مذہب کی چاہے پیروی کرے‘ جو چاہے عقیدہ رکھے‘ جس طرح چاہے عبادت کرے‘ البتہ سیاسی‘ معاشرتی اور معاشی زندگی کے اصول طے کرنا لوگوں کی آزاد مرضی پر منحصر ہے۔ گویا جو بات دینِ الٰہی یا وحدتِ ادیان کے نام سے پیش کی جاتی رہی ہے‘ اسے جدید انداز میں سیکولرزم کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کو تقویت فراہم کرنے کے لیے قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت کا ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانا پہلی مرتبہ نہیں ہے۔

اس تمام نظریہ کی نفی کے لیے پانچویں رکوع کی وہ آیات موجود ہیں جن میں یہود کو محمد ﷺ پر ایمان لانے کی پُرزور دعوت دی گئی ہے اور جو بعد کے دس رکوعوں میں شامل آیات کے لیے ایک مشترک عنوان (common factor) کے طور پر لائی گئی ہیں۔

## ’’وحدتِ اَدیان‘‘ کا قرآنی تصور

وحدتِ ادیان کا مذکورہ بالا نظریہ یقیناً پرلے درجے کی گمراہی ہے‘ تاہم ’’وحدتِ ادیان‘‘ کا جو تصور ہمیں قرآن حکیم سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام کی دعوت دینِ اسلام ہی کی دعوت تھی۔ اس طرح کہ تمام ادیان اصلاً ایک ہیں‘ دنیا میں جتنے بھی ادیان ہیں ان کا origin ایک ہے۔ ظاہر ہے تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور حضرت آدمؑ اللہ کے نبی تھے‘ چنانچہ دنیا میں جتنے بھی انبیاء ورسل آئے ہیں وہ یقیناً دینِ اسلام ہی کے حامل تھے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر جو لوگ ایمان لائے تھے وہ بلاشبہ دینِ حق کے پیروکار تھے۔ مثلاً سورۂ یونس کی آیت ۱۹ میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ﴾

’’اور نہیں تھے تمام انسان مگر ایک اُمت‘ پھر انہوں نے باہم اختلاف کیا۔‘‘



یعنی ابتداءً سارے انسان ایک ہی اُمت تھے‘ بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنا لیے۔

یہی مضمون اسی سورۃ البقرۃ میں مزید نکھر کر سامنے آتا ہے۔ فرمایا:

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢١٣﴾﴾

’’ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے۔) تب اللہ نے نبی بھیجے جو (راست روی پر) بشارت دینے والے اور (کج روی کے نتائج سے) خبردار کرنے والے تھے‘ اور ان کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی تاکہ (حق کے بارے میں) لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے —— (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں!) اس میں اختلاف تو ان ہی لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا‘ انہوں نے روشن ہدایات پالینے کے بعد محض اس لیے حق چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ (انبیاء علیہم السلام پر) ایمان لائے انہیں اللہ نے اپنے اِذن سے اس حق کا راستہ دکھایا جس میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔‘‘

چنانچہ یہ اختلاف اندھیرے میں نہیں ہوتا‘ باہم ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہوتا ہے‘ انسان جان بوجھ کر ٹھوکر کھاتا ہے‘ ایک دوسرے پر سبقت اور بالادستی حاصل کرنے کی خاطر حق سے اعراض کرتے ہوئے غلط راستے اختیار کرتا ہے‘ ورنہ یہ بات نہیں کہ حق نظر نہیں آتا۔ ابوجہل مانتا تھا کہ محمد ﷺ جھوٹ نہیں بولتے‘ لیکن خاندانی اور گروہی رقابت آڑے آتی تھی۔

شروع میں تمام انسان ایک تھے اور ایک ہی دین تھا۔ یہودیت‘ نصرانیت اور صابیت کا تعلق چونکہ اسی علاقے سے تھا جہاں قرآن حکیم نازل ہو رہا تھا اور اس لیے بھی کہ ان کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تھا لہٰذا قرآن حکیم میں ان کا ذکر ہے‘ ورنہ دنیا کے دیگر مذاہب بھی اصلاً اسلام ہی تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد تو انہی کی نسل سے تمام انبیاء آئے

ہیں‘ لیکن ان سے قبل حضرت نوح علیہ السلام کی نسل سے بھی تو یقیناً انبیاء ہوں گے جن کے پیروکار دنیا میں رہے ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ان کا اصل دین سے دُور کا تعلق بھی باقی نہیں رہ گیا‘ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب دینِ اسلام ہی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔

## وحدت کی انسانی خواہش اور اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق

میرے نزدیک وحدتِ ادیان کی خواہش کا ابھرنا ایک فطری امر ہے‘ کیونکہ کوئی بھی انسان ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل کشاکش یا محاذ آرائی کی حالت میں رہنا پسند نہیں کرتا‘ خاص طور پر آج کی دنیا میں اس خواہش نے شدت اختیار کر لی ہے‘ اس لیے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے نتیجہ میں مختلف خطوں کے درمیان فاصلے بالکل کم ہو کر رہ گئے ہیں‘ دنیا سکڑ کر ایک عالمی گاؤں (global village) کی شکل اختیار کر گئی ہے‘ اور یہ جو تفرقات ہیں‘ خصوصاً مذہب کی بنیاد پر‘ ان میں بڑی شدت ہوتی ہے۔ گویا یہ خواہش تو طبعی ہے‘ انسان مل جل کر امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ گاہے سیاسی ضرورت اور گاہے روحانی و مذہبی تقاضے کے طور پر مختلف اوقات میں یہ فلسفہ سامنے آتا رہا ہے‘ لیکن ہمارے لیے اصل بات یہ ہے کہ قرآن حکیم اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے بات بالکل دوسری ہے‘ اللہ کا اپنا الگ اصول اور تقاضا ہے‘ نہ کہ جو ہم چاہتے ہیں وہی اللہ کا بھی مقصد اور مدعا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَھُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِہٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَھُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۸﴾﴾ (الشوریٰ)

’’اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا‘ مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے‘ اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔‘‘

اللہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک اُمت بنا دیتا‘ سب حقیقی مسلمان ہوتے‘ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں تھا‘ لیکن اللہ کے پیش نظر یہ ہے ہی نہیں‘ اللہ نے تو انسان کو امتحان اور آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے‘ اس لیے جو انسان اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی کوشش کرے گا صرف اسی کو جنت میں داخلہ ملے گا‘ یہ نہیں کہ سب کے لیے جنت تیار کر رکھی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انبیاءِ کرامؑ اور کتابیں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی‘ ایک ہی طرح سب انسانوں کو نیک بنا دیا جاتا۔ مزید فرمایا:



﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ یُّضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ﴾ (النحل:۹۳)

’’اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی (کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا‘ مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔‘‘

دونوں آیات میں تقریباً ایک جیسے الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق ہی یہ ہے۔ یہ دُنیوی زندگی ایک آزمائش ہے‘ یہاں ایک درجہ بندی ہو کر رہنی ہے اور اس کی بنیاد یہی ہے کہ جو نیکی کا طلبگار ہو گا اللہ اسے ہدایت دے گا اور جو گمراہی کی روش اختیار کرے گا اسے گمراہی ملے گی۔ سورۂ ہود کی آیات ۱۱۸‘ ۱۱۹ ملاحظہ ہوں:

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ ؕ وَلِذٰلِکَ خَلَقَھُمْ ؕ﴾

’’اور اگر تیرا ربّ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی اُمت بنا دیتا‘ مگر اب تو وہ مختلف طریقوں پر ہی چلتے رہیں گے۔ سوائے ان کے جن پر تیرے ربّ کی رحمت ہے (وہ بے راہ رویوں سے بچتے رہیں گے) —— اور اسی (آزادیٔ انتخاب و اختیار اور امتحان) کے لیے تو اللہ نے انہیں پیدا کیا تھا۔‘‘

آخری طور پر یہ مضمون سورۃ المائدہ میں آیا ہے جو مدنی سورہ ہے‘ پہلی تینوں مکی سورتیں تھیں۔ فرمایا:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىکُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ؕ اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾

’’اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک اُمت بھی بنا سکتا تھا‘ لیکن اس نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے‘ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو اللہ ہی کی طرف جانا ہے‘ پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔‘‘

لہٰذا اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہمیں یہ بات خواہ کتنی ہی بھلی نظر آئے اور کتنی ہی وقتی تقاضوں پر مبنی محسوس ہو‘ لیکن تمام انسانوں کا ایک اُمت ہونا اللہ تعالیٰ کے مقصدِ تخلیق کے منافی

ہے۔ یہاں تو سیدھی سیدھی بات ہے کہ جو حق ہے اس کا بول بالا کرو‘ اس پر جمے رہو‘ ڈٹے رہو‘ محض رواداری‘ یکجہتی یا کوئی اتحاد پیدا کرنے کے لیے لچک دکھانا اور کچھ give and take کرنا حق سے انحراف اور مداہنت ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کو فرمایا گیا:

﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ⑧ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ⑨﴾ (القلم)

’’آپ ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آئیں۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے پڑیں تو یہ بھی (آپ کی مخالفت میں) کچھ نرمی اختیار کر لیں۔‘‘

وہ تو چاہتے ہیں کہ آپؐ مداہنت کریں‘ لیکن آپؐ ہرگز ان کی باتوں پر توجہ نہ دیجیے اور اس پر ڈٹے رہیے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔

اس کا تعلق اس حدیث سے بھی جڑتا ہے جس میں فرمایا گیا کہ ((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا)) اسلام کا آغاز اس حال میں ہوا تھا کہ غریب یعنی اجنبی تھا۔ جاننے پہچاننے والے کم تھے۔ پھر اسے غلبہ حاصل ہوا اور جسے غلبہ حاصل ہو اُس کے سبھی دوست ہوتے ہیں۔ فرمایا: ((وَسَيَعُوْدُ غَرِيْبًا كَمَا بَدَأَ)) اسلام عنقریب ایسا ہی ہو جائے گا جیسا شروع میں اجنبی تھا۔ مسلمان اگرچہ بہت ہوں گے‘ مگر اسلام غریب ہوگا۔ آج دنیا میں ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ مسلمان ہیں‘ لیکن اسلام کہاں ہے؟ چنانچہ اسلام کے مطابق کوئی شخص زندگی گزارنا چاہے گا تو وہ معاشرے میں اجنبی ہو کر رہ جائے گا۔ آپ اس کا فیصلہ کر لیں تو آپ کے قریب کوئی نہیں آئے گا‘ لوگوں کو آپ کے ساتھ رشتہ داری پسند نہیں ہوگی‘ آپ کو دقیانوسی اور رجعت پسند شمار کیا جائے گا۔ تو فرمایا: ((فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ)) پس مبارکباد ہے ان لوگوں کو جو خود اجنبی بننا گوارا کر لیں لیکن اسلام کا دامن نہ چھوڑیں۔ (مسلم‘ بروایت ابوہریرہؓ)

## میثاق النّبیّین

اب اس سلسلہ میں ایک اور دلیل نوٹ کیجئے اور وہ ہے ’’میثاق النّبیّین‘‘:

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٨١﴾﴾ (آل عمران)

’’ذرا یاد کرو جب اللہ نے تمام نبیوں سے یہ عہد لیا تھا کہ جو کچھ میں نے تمہیں کتاب اور



حکمت سے عطا کیا ہے‘ پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم کو لازماً اُس پر ایمان لانا ہوگا اور لازماً اس کی مدد کرنی ہوگی۔ فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ انہوں نے کہا: ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں سے ایک عہد لیا تھا‘ جیسا کہ میثاقِ الست تھا جو تمام انسانوں سے لیا گیا تھا اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کے جسمانی وجود سے بہت پہلے ارواحِ انسانی پیدا کی گئی تھیں۔ اسی طرح انبیاءِ کرام علیہم السلام کی ارواح سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جب میں تم میں سے کسی کو کتاب اور حکمت دوں گا اور اس کے بعد کوئی اور نبی آئے گا جو تصدیق کرے گا اس کی جو اس سے پہلے انبیاء کو دیا گیا تھا تو تم لازماً اس پر ایمان لاؤ گے اور لازماً اس کی مدد کرو گے۔ مطلب یہ کہ ایک نبیؑ آئے‘ اللہ نے انہیں کتاب دی‘ حکمت سے نوازا‘ ان کے جو پیروکار ہیں وہ ایک اُمت بن گئے‘ اب ان کے بعد ایک اور نبی آ گئے‘ تو سابقہ انبیاءؑ کے پیروکاروں پر لازم ہے کہ نئے آنے والے نبیؑ پر ایمان لائیں اور ان کے دست و بازو بنیں۔ اللہ تعالیٰ نے آخر میں سوال کیا: کیا تم نے اقرار کیا اور میرے اس عہد اور میثاق کو قبول کیا؟ تو انہوں نے کہا: ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا: گواہ رہنا‘ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ رہوں گا۔ ہر نبی کے ذریعے سے اس کی اُمت سے جب اللہ نے یہ عہد لیا ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ بس نجات کے لیے اپنے اپنے نبی پر ایمان رکھنا کافی ہو جائے گا! یہ تصور اس آیہ مبارکہ کی قطعی نفی ہے۔

## بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ سے عہد

خاص طور پر بنی اسرائیل کا جو عہد تھا اس کو بھی نوٹ کر لیجیے۔ سورۃ البقرہ کے پانچویں رکوع میں بنی اسرائیل سے جو کہا جا رہا ہے کہ ﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ ’’تم میرا عہد پورا کرو تا کہ میں تم سے اپنا عہد پورا کروں‘‘ وہ کون سا خصوصی عہد تھا جو بنی اسرائیل سے ہوا ہے؟ اس ضمن میں سورۃ الاعراف کی آیات ۱۵۶ تا ۱۵۸ بہت اہم ہیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آئی اور حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے چیدہ افراد کو لے کر کوہ طور پر گئے تو وہاں انہوں نے درخواست پیش کی تھی کہ: ﴿وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ﴾ ’’اے ربّ! ہمارے لیے اس دنیا اور آخرت کی زندگی میں خیر اور بھلائی مقدر کر دے‘ ہم تیری ہی جناب میں رجوع کرتے ہیں‘‘۔ اس لفظ (هُدْنَا)

کو نوٹ کیجیے‘ اس لیے کہ اس لفظ کا یہود کے ساتھ بھی تعلق ہے‘ یعنی لوٹنا‘ رجوع کرنا‘ پلٹنا۔

﴿قَالَ عَذَابِیْۤ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ ۫ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾﴾ (الاعراف)

’’(اللہ تعالیٰ نے جواب میں) فرمایا: جہاں تک میرے عذاب کا تعلق ہے وہ تو میں دوں گا جس کو چاہوں گا‘ مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ (یعنی میری یہ رحمت سب کے لیے عام ہے‘ ہر شے کا وجود میری رحمت کا ہی مرہونِ منت ہے) لیکن میری خاص رحمت ان لوگوں کے لیے ہے جو تقویٰ کی روش اختیار کریں گے‘ زکوٰۃ ادا کریں گے اور ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ اور وہ لوگ جو اتباع کریں گے اس پیغمبر‘ نبی امی (ﷺ) کا جس کا ذکر وہ موجود پائیں گے اپنے ہاں (پیشین گوئی کے طور پر) تورات اور انجیل دونوں میں لکھا ہوا۔ وہ انہیں نیکیوں کا حکم دے گا‘ بدی سے روکے گا‘ تمام پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال ٹھہرائے گا اور ناپاک و نجس چیزوں کو حرام قرار دے گا‘ اور ان پر پڑے ہوئے ناروا بوجھ ان سے اتارے گا اور انہیں ان بندشوں سے نجات دلائے گا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اُس پر ایمان لائیں گے‘ اُس کی تعظیم کریں گے‘ اُس کی مدد کریں گے اور اُس نور کا اتباع کریں گے جو اُس کے ساتھ نازل کیا جائے گا‘ وہی لوگ فلاح پائیں گے۔‘‘

بنی اسرائیل سے یہ عہد محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا۔ چنانچہ اگلی آیت میں نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ِۨ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾﴾



’’(اے نبی ﷺ! ڈنکے کی چوٹ) کہیے کہ اے لوگو! میں تم سب کے لیے اس اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام زمین و آسمان پر ہے‘ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ وہی زندگی اور موت دینے والا ہے‘ پس ایمان لاؤ اُس نبی اُمی رسول پر جو اللہ اور اُس کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہے (اللہ کی تمام سابقہ کتابوں پر ایمان رکھتا ہے) تاکہ تم فلاح سے ہمکنار ہو۔‘‘

قرآن حکیم کی متذکرہ بالا آیات کی روشنی میں درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱) سیاق و سباق سے ہٹ کر صرف کسی ایک آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا نجات کی شرط لازم نہیں ہے‘ محض کجی اور گمراہی ہے۔

۲) انبیاء کرام علیہم السلام سے لیے گئے عہد کی رو سے ہر نئے آنے والے نبی پر ایمان لانا لازم تھا۔

۳) بنی اسرائیل سے خاص طور پر یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ نبی آخر الزماں‘ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں گے۔

## زیر مطالعہ آیت کا اصل مفہوم

اب ذرا اس آیت زیر مطالعہ کے الفاظ پر بھی غور کر لیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ’’یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے‘‘ مراد مسلمان ہیں۔ ہمیں درحقیقت یہ دیکھنا ہے کہ یہ آیت کس مقصد اور مفہوم میں یہاں آئی ہے۔ تمام انسانوں اور اُمتوں کا ایک مشترک روگ یہ ہے کہ وہ کسی ملت یا اُمت میں شامل ہونے کے بعد اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کی نجات کا انحصار صرف اس اُمت میں شمولیت پر ہے‘ حالانکہ اُمت میں شامل ہونا اخروی نجات کی قطعاً ضمانت نہیں ہے‘ کیونکہ اخروی نجات کے لیے اپنا ذاتی ایمان اور نیک عمل کا ہونا لازم ہے۔ یہ تصور کہ ’’چونکہ تیرے محبوب کی اُمت سے ہیں‘ لہٰذا جنت ہمارا حق ہے‘ عمل خواہ کچھ بھی ہو‘‘ ایک باطل تصور ہے۔ یہ مغالطہ بنی اسرائیل کو ہوا اور ہر ایک کو ہو جاتا ہے‘ حالانکہ ایک شخص اللہ کے نبی ﷺ کے ساتھ مل کر دشمن کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے شہید ہو جاتا ہے‘ لوگ کہتے ہیں کہ سیدھا جنت میں گیا‘ لیکن نبی ﷺ فرماتے ہیں: میں نے اسے جہنم میں دیکھا ہے‘ اس لیے کہ زخموں کی تاب نہ لا کر اس نے خودکشی کر لی تھی جو حرام ہے۔

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: کوئی شخص اپنی شجاعت اور بہادری کے اظہار کے لیے جنگ کرتا ہے‘ کوئی حمیتِ جاہلی کی وجہ سے‘ کسی خاص قبیلہ سے خاندانی دشمنی کی بنا پر‘ کوئی مالِ غنیمت

کی طلب میں‘ ان میں سے کون مجاہد فی سبیل اللہ شمار ہوگا؟ فرمایا: کوئی بھی نہیں‘ بلکہ ((مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))(۱) یعنی جہاد فی سبیل اللہ صرف اور صرف اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہوگا۔ میں نے اپنی کتاب ’’سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی‘ حال اور مستقبل‘‘ میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ دنیا میں قوموں پر جو عذاب آتا ہے وہ اجتماعی ہوتا ہے‘ لہٰذا اس میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ﴾ (الانفال: ۲۵) ’’ڈرو اُس عذاب سے جو صرف ظالموں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا‘‘۔ لیکن اس کے بالکل برعکس آخرت کا معاملہ فرداً فرداً ہوگا۔ یعنی دنیا میں اجتماعی مگر آخرت میں انفرادی معاملہ ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اُمتِ موسوی ہی اُمتِ مسلمہ تھی‘ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد یہود کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا لازم تھا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد تک حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے اُمتِ مسلمہ تھے‘ جبکہ اس کے بعد محمد ﷺ پر ایمان لانا شرطِ لازم ہے۔ البتہ نجاتِ اُخروی کا انحصار نہ حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ کی اُمت میں ہونے پر تھا اور نہ اب اُمتِ محمدؐ میں ہونے پر ہے۔ لہٰذا مذکورہ آیت سے جن مضامین کا آغاز ہو رہا ہے ان کا تعلق انہی غلط نظریات اور تصورات کی نفی سے ہے۔ اس کے بعد وہ مضامین ہیں جن کا تعلق اہلِ یہود پر تاریخی حوالہ سے ان کی واقعاتی غلطیوں کی بنا پر عائد کردہ فردِ جرم سے ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے بعد فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ اب دیکھیے یہاں لفظ بنی اسرائیل نہیں آیا‘ بلکہ الَّذِيْنَ هَادُوْا آیا ہے‘ اور یہ وہ الفاظ ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دینِ حق پر ہونے کی بنیاد پر استعمال کیے تھے ﴿اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ﴾۔ اگرچہ یہودیوں نے اپنے لیے حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یہودا کی نسل سے ہونے کو بنیاد بنایا ہے۔ یہی نام عیسائیوں کے ایک فرقہ کا بھی ہے ’’یہوواز وٹنیسز‘‘ (JEHOVAS WITNESSES)‘ یہوا اللہ کے نام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال یہ جو مسلک بنا‘ اس میں صرف بنی اسرائیل ہی نہیں‘ ان کے طور طریقوں کی پیروی کرنے والے دوسرے لوگ بھی شامل ہیں۔ اس لیے یہاں لفظ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الجھاد والسیر‘ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الامارۃ‘ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللّٰہ۔



بنی اسرائیل نہیں آیا۔

اس کے بعد ﴿وَالنَّصٰرٰى﴾ یہ لفظ ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ ایک دوسری نسبت بھی ہے جو ناصرہ یا نصران نام کے ایک قصبہ کے حوالہ سے ہے‘ یہ قصبہ بیت المقدس سے ۷۰ میل شمال میں بحیرۂ روم کے ساحل سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر تھا اور اب بھی موجود ہے۔ اسے نضارت بھی کہتے ہیں اور اسی کی نسبت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح ناصری (Jesus of Nazaret) کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ حضرت مریمؑ کا تعلق اسی قصبہ سے تھا‘ لیکن قرآن مجید کی رو سے لفظ نصاریٰ کا تعلق ’’انصار اللہ‘‘ سے ہے۔ ’’نصاریٰ‘‘ حضرت مسیحؑ کے خلیفہ برحق پیٹر یا شمعون کے پیروکار تھے جو حضرت عیسیٰؑ کے اصل دین پر تھے اور وہ بہت عرصہ تک ’’نضارین‘‘ بھی کہلاتے رہے۔ سینٹ پال‘ جو عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ان کا شدید دشمن تھا‘ بعد میں اس نے کہا کہ مجھے رؤیاء ہوا ہے اور میں نے حضرت مسیحؑ کا دین اختیار کر لیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے دین میں ساری تبدیلیاں اسی کی پیدا کردہ ہیں اور اس کے ایجاد کردہ دین کو ماننے والے اب عیسائی (Christians) کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہمیشہ لفظ نصاریٰ (Nazaren) آیا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو ماننے والے اصل وہ تھے‘ لہٰذا قرآن صرف ان کا نام لے رہا ہے اور اس حوالہ سے یہ آیت نازل ہو رہی ہے‘ یعنی جو ان میں شامل تھا وہ اپنے ایمان اور عمل کے ناطے پائے گا‘ جو پائے گا۔ ظاہر بات ہے جب ان سب کا الگ الگ نام لے کر کہا جا رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اُس وقت جو اصل دین کے پیروکار تھے ان کا یہ معاملہ ہے۔ ان میں کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے تھے اور کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے‘ جبکہ ہم حضرت موسیٰؑ‘ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ سب کے ماننے والے ہیں۔ چونکہ یہ چیز مشترک تھی اس لیے صرف ایمان اور نیک اعمال کی بات کی گئی ہے۔

صابئین کے بارے میں ہمارے ہاں بہت سے اقوال اور آراء پائی جاتی ہیں۔ اب چونکہ اس نام سے دنیا میں کوئی فرقہ موجود نہیں ہے‘ لہٰذا اختلافِ رائے کا ہونا غیر معمولی بات نہیں‘ البتہ ایک بات یقینی ہے کہ یہ بھی اہل کتاب میں سے تھے کیونکہ ان کا تذکرہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ کیے جانے کا مطلب ہی یہ ہے۔ نیز حضرت عمر اور عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) کا قول بھی یہی ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ یہ اہل کتاب ہیں اور ان کا ذبیحہ کھانا جائز ہے۔ ان کے بارے میں دو آراء زیادہ نمایاں ہیں‘ ایک یہ کہ یہ اپنے آپ کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی اُمت کہتے تھے اور نزولِ اسلام کے وقت یہ لوگ ایران اور شام کی سرحد پر کہیں

کہیں موجود بھی تھے۔ لیکن میرے نزدیک دوسری رائے زیادہ قرینِ قیاس ہے' وہ یہ کہ یہ لوگ براہِ راست حضرت ابراہیمؑ سے اپنے آپ کو منسوب کرتے تھے' اس لیے کہ اس آیت میں حضرت محمد ﷺ اور حضرت موسیٰؑ کی اُمتوں کا نام آیا ہے اور ان اولوالعزم پیغمبروں میں حضرت ابراہیمؑ بھی شامل ہیں' جن کا تعلق اسی علاقہ سے تھا' تو ان کے ساتھ بھی کچھ لوگ رہے ہوں گے جو حضرت ابراہیمؑ سے تو اپنے آپ کو منسوب کرتے رہے لیکن ان کے بعد دوسرے کسی پیغمبر پر ایمان نہ لائے۔ آپ کو معلوم ہے حضرت ابراہیمؑ سے ایک نسل حضرت اسمٰعیلؑ کی چلی ہے جو حجاز میں آباد تھی۔ اس نسل میں اڑھائی ہزار سال تک کوئی نبی اور رسول نہیں آئے' لہٰذا یہ کہتے تھے کہ ہم حنفی یعنی حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں' گو ان کے پاس نہ کوئی صحیفہ تھا نہ شریعت' اور وہ بدترین شرک میں مبتلا تھے' لیکن آخر اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور انہی میں آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ دوسری شاخ حضرت اسحاقؑ سے ہے' جس میں دراصل انبیاء و رسل کا تسلسل رہا' اگرچہ حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ منقطع رہا ہے اور اس دوران اس نسل میں بھی کوئی نبی نہیں ہوا' لیکن پھر حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان دوبارہ یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری رہا ہے۔ نسلِ انسانی کا یہ چودہ سو سالہ عرصہ اس لحاظ سے بڑا عجیب ہے کہ اس میں نبوت کا تار کہیں ٹوٹا ہی نہیں۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں نبی کریم ﷺ کی ایک مشہور حدیث ہے:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَاءِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ))

''بنی اسرائیل کی قیادت ہمیشہ انبیاء کے پاس رہی ہے' جب بھی ایک نبی فوت ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی موجود ہوتا۔''

بلکہ اس سنہری زنجیر کے آغاز میں اور آخر میں بیک وقت دو دو نبی موجود تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ حضرت ہارونؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ حضرت یحییٰؑ۔ بہرحال یہ تو ایک بہت ہی غیر معمولی واقعہ ہے' لیکن آپ کو معلوم ہے حضرت ابراہیمؑ کی ایک تیسری بیوی بھی تھیں اور ان سے اولاد بھی ہوئی ہے جو بنی قتورہ کہلاتی تھی۔ ان میں سے ایک شاخ کا تو ہمیں معلوم ہے' جس میں مدین یا مدیان ان کے ایک بیٹے تھے جن کی نسل میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی ہے' لیکن ان کی دوسری اولاد بھی اسی علاقہ میں کہیں آباد تھی۔ اس میں یا تو آگے کوئی نبی نہیں آئے' یا پھر قرآن میں ان کا تذکرہ نہیں ہے' اور اگر ان میں کوئی نبی نہیں آئے تو ان میں جو لوگ رہے وہ میرے نزدیک صابئین ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف اپنے آپ کو



منسوب کرتے رہے۔ اور وہی علاقہ ہے عراق اور شام کا جہاں حضرت ابراہیمؑ کی اولاد آباد رہی۔ اسی علاقہ میں حضرت یعقوب بن اسحٰق علیہما السلام کی نسل مصر سے واپس آنے کے بعد رہی ہے' فلسطین میں ان کی حکومت بھی قائم ہوگئی۔ حضرت ابراہیمؑ کی تیسری بیوی کی نسل سے جو لوگ تھے وہ ذرا ہٹ کر شام اور عراق کے سرحدی علاقوں میں آباد ہوگئے۔

بہرحال اس آیت کا اصل مفہوم اس طرح ہے: ''یقیناً وہ لوگ جو اسلام لائے اور وہ جو یہودی ہوئے' اور وہ جو نصرانی ہوئے اور جو صابی رہے' ان میں سے جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخر پر (یعنی اپنے اپنے وقت میں' اپنے اپنے دَور میں) اور اس نے عملِ صالح کی روش اختیار کی تو اللہ کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے' ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے' نہ حزن۔''

جب تک حضرت مسیحؑ نہیں آئے' یہ دَور حضرت موسیٰؑ کا رہا' اس میں جو یہودی یعنی حضرت موسیٰؑ کے پیروکار تھے اگر ان کا اللہ اور آخرت پر ایمان تھا۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ کے دور میں جو بھی اللہ پر' حضرت مسیحؑ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا تھا اور اس کا عمل درست تھا تو اس کے لیے کوئی خوف و حزن نہیں اور اللہ کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے۔ گویا انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ صرف منسوب ہونا نجات کی ضمانت نہیں ہے' بلکہ اپنے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ساتھ ساتھ اللہ اور آخرت پر ایمان' جس کے نتیجے میں عمل درست ہو جائے' لازم ہے۔ یعنی اصل بنائے نجات اللہ اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح ہے' محض کسی گروہ' اُمت یا شخصیت کے ساتھ وابستگی نجات کی ضمانت نہیں۔

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم ○○

جہاد فی سبیل اللہ
اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا ایک جامع خطاب
اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 15 روپے

# امر بالمعروف ونہی عن المنکر

عتیق الرحمٰن صدیقی

﴿وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ
اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ
كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿١٦٣﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ
قَوْمًا ۙ ۨاللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ
وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿١٦٤﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ
وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ ۢ بَئِيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿١٦٥﴾ فَلَمَّا عَتَوْا
عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿١٦٦﴾﴾ (الاعراف)

’’اور ذرا ان سے اس بستی کا حال پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت (ہفتہ) کے دن احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن اُبھر اُبھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ یہ اس لیے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے۔ اور انہیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے سے کہا تھا کہ ’’تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا سخت سزا دینے والا ہے‘‘ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ’’ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کے حضور معذرت پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں‘‘۔ آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انہیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ پھر جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کیے چلے گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا تو ہم نے کہا کہ بندر ہو جاؤ ذلیل و خوار۔‘‘



سبت یعنی ہفتہ کا دن بنی اسرائیل کے لیے مقدس ٹھہرایا گیا تھا اور یہ تاکید کی گئی تھی کہ وہ اس دن کو صرف عبادت کے لیے مختص رکھیں اور اس روز کوئی دُنیوی کام نہ کریں‘ گھروں میں آگ تک نہ جلائیں‘ جانوروں اور غلاموں سے بھی کوئی خدمت نہ لیں‘ اور جو شخص اس ضابطہ کے خلاف عمل کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن بنی اسرائیل نے اس ہدایت پر عمل کرنے کے بجائے اس کی علانیہ خلاف ورزی شروع کر دی اور اللہ کی حدود کا کوئی پاس نہ کیا۔ اللہ کے فرمان سے یہ بغاوت حساس طبیعتوں پر بہت گراں گزرتی تھی۔ قرآن حکیم کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کے کنارے آباد اس بستی کے مکینوں کے خیالات میں ہم آہنگی موجود نہ تھی۔ ایک گروہ ایسا تھا جو کھلم کھلا احکامِ الٰہی سے انحراف کر رہا تھا اور اسے اللہ کی حدود پھلانگنے میں کوئی عار نہ تھا۔ دوسرا گروہ ایسا تھا جو اس برائی میں ملوث نہ تھا مگر مہر بلب تھا‘ اس کا کردار خاموش تماشائی کا سا تھا‘ الٹا نہی عن المنکر کا فرض نبھانے والوں سے کہتا تھا کہ ان کی سعی لاحاصل ہے۔ مگر یہ لوگ جو نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے‘ مجرمین کی روش ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ ان کی غیرتِ ایمانی انہیں مجبور کرتی تھی کہ وہ اپنا داعیانہ کردار ادا کرتے رہیں‘ شاید کہ یہ شقاوت زدہ گروہ راہ راست پر آ جائے اور وہ اللہ کی بارگاہ میں اپنی معذرت پیش کر سکیں۔ مگر بدی کا ارتکاب کرنے والے اپنے طرزِ عمل پر نہ شرماتے اور انہوں نے احکامِ الٰہی سے سرکشی و بغاوت کو اپنا معمول بنائے رکھا۔ چنانچہ اس بستی کو اللہ کے عذاب نے آن لیا۔ صرف وہی گروہ عذاب سے محفوظ رہا جس نے معروف کی تلقین اور منکر کی نہی کا عمل برقرار رکھا۔ قرآن حکیم کی تصریح کے مطابق گناہوں کی آلودگیوں میں گرفتار اور غیر جانبدار گروہ اللہ کے عذابِ شدید سے دوچار ہو کر رہے۔ صاحبِ تفہیم القرآن رقم طراز ہیں کہ:

> ’’جس بستی میں علانیہ احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہو وہ ساری کی ساری قابل مؤاخذہ ہوتی ہے اور اس کا کوئی باشندہ محض اس بناء پر مؤاخذہ سے بری نہیں ہو سکتا کہ اس نے خود خلاف ورزی نہیں کی‘ بلکہ اسے خدا کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لازماً اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہو گا کہ وہ اپنی حد استطاعت تک اصلاح اور اقامتِ حق کی کوشش کرتا رہا۔ پھر قرآن اور حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی ہم کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی جرائم کے باب میں اللہ کا قانون یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ ’’ڈرو اس فتنہ سے جس کے وبال میں خصوصیت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہیں

ہوں گے جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو‘ اور اس کی تشریح میں نبی ﷺ فرماتے ہیں:

**ان اللّٰہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظھرانیھم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروہ‘ فاذا فعلوا ذٰلک عذّب اللّٰہ الخاصّۃ والعامّۃ** یعنی اللہ عزوجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے برے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہار ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہار ناراضی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔‘‘ (الاعراف‘ حاشیہ ۱۲۵)

نظام معاشرت کو صحت مند بنیادوں پر قائم رکھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی اصلاح کا عمل بھی جاری رہے اور افراد کے باہم روابط میں مؤانست اور بھائی چارے کی خوشبو عنبر فشاں رہے۔ اخلاق کے وجود کا انحصار آپس کے تعلقات اور وابستگی میں مضمر ہے۔ تجرد‘ عزلت نشینی‘ کم آمیزی اور گوشہ گیری سے اخلاق کے خدوخال اجاگر نہیں ہو پاتے۔ رہبانیت اور جوگی پن سے معاشرے کے نشوونما و ارتقاء میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں‘ صرف اپنی ذات کے ارتکاز کو غذا میسر آتی ہے۔ خدا رسیدگی کا ایسا تصور پنپنے لگتا ہے جو حسن معاشرت کے لیے سودمند نہیں ہوتا۔ اسلام نے اپنے اصولِ اخلاق میں ایسی مجردانہ زندگی جس میں کسی کو کسی سے سروکار نہ ہو‘ کی ہمت افزائی نہیں کی اور اسے ایک بدعت سے تعبیر کیا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی جہد و عمل سے عبارت رہی۔ صحابہ کرام ؓ نے بھی یہی طرزِ عمل اپنایا اور محدود اجتماعیت کے بجائے وسیع تر اجتماعیت کے تحفظ کو اپنی زندگیوں کا مرکز و محور بنایا۔ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فریضہ حسن و خوبی سے نبھایا‘ حقوق و فرائض کی ادائیگی کا ایک متوازن پیمانہ مقرر کیا۔ جائز ذاتی مصلحتوں پر نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی و معاشرتی مصالح کو بھی درخورِ اعتناء سمجھا۔ صرف اپنی بھلائی اور خیر ہی کو پیش نظر نہیں رکھا‘ بلکہ دوسروں کو بھی ضلالت و گمراہی سے بچانے کے لیے مضطرب اور پریشان رہے۔ انہوں نے قرآن حکیم کی اس ہدایت کی متابعت کی کہ ﴿قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا﴾ (التحریم) ’’تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ‘‘۔ گویا مؤمن کا فرض صرف اپنے آپ ہی کو آگ سے بچانا نہیں بلکہ دوسروں کو بھی بچانا ہے۔ جیسا کہ اصحابِ سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور دعوت و تبلیغ سے تغافل برتنے والے گروہ کو بھی گنہگاروں میں شامل کیا گیا ہے۔ حضور نبی



کریم ﷺ نے واضح طور پر اہل ایمان سے تخاطب اختیار کرتے ہوئے فرمایا:

((کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ، وَالْاَمِیْرُ رَاعٍ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی اَھْلِ بَیْتِہٖ، وَالْمَرْاَۃُ رَاعِیَۃٌ عَلٰی بَیْتِ زَوْجِھَا وَوَلَدِہٖ، فَکُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ وَفِیْ رِوَایَۃٍ وَالْخَادِمُ رَاعٍ عَلٰی مَالِ سَیِّدِہٖ)) (متفق علیہ)

’’تم میں سے ہر ایک نگران و محافظ ہے اور تم میں سے ہر ایک سے پوچھا جائے گا ان لوگوں کی بابت جو تمہاری نگرانی میں ہوں گے۔ امیر بھی نگران ہے اور اس سے بھی اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا‘ اور شوہر اپنے گھر والوں کا نگران ہے‘ اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگران ہے‘ اور نوکر اپنے آقا کے مال کا نگران ہے۔ پس تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے ان لوگوں کی بابت پوچھ گچھ ہوگی جو اس کی نگرانی میں دیے گئے ہیں۔‘‘

اسلامی معاشرے میں جب باہمی تعلقات میں اختلال آنے لگے‘ بھائی چارگی اور محبت کی کیفیت نفسانیت کی بھینٹ چڑھنے لگے‘ برائی کی تُند و تیز آندھی سے صورت حال تلپٹ ہونے لگے‘ باطل اپنا پھریرا لہرانے پر کمربستہ ہو تو اہلِ ایمان کا فرض بنتا ہے کہ وہ آپس کی رنجشوں کو مٹائیں اور بگاڑ کے سدّباب کے لیے آگے بڑھیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ﴾ (الحجرات:۱۰) ’’مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں‘ پس (اگر آپس میں رنجش پیدا ہو جائے تو) اپنے دونوں بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو‘‘۔ معاشرے میں بھلائی اور خدا ترسی کے کاموں کی ہمت افزائی کی جائے۔ سورۃ المائدۃ میں فرمایا گیا: ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (آیت ۲) ’’نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو لیکن گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد مت کرو‘‘۔ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کو ابھارتے ہی رہنا چاہیے۔ فرمایا: ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (التوبۃ:۷۱) ’’مؤمن مرد اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ وہ آپس میں نیکی کا حکم کرتے رہتے ہیں اور برائی کے کاموں سے ایک دوسرے کو روکتے رہتے ہیں‘‘۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے۔ اگر یہ بھی نہ

ہو سکے تو اس کو دل سے برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے‘‘۔ (صحیح مسلم‘ کتاب الایمان)

رسول اکرم ﷺ نے جب یہ ہدایت فرمائی کہ: ((اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا)) ’’اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو چاہے مظلوم‘‘ تو صحابہؓ نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! مظلوم بھائی کی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر ظالم کی مدد کس طرح کی جائے؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((تَحْجُزُهُ اَوْ تَمْنَعُهُ مِنَ الظُّلْمِ فَاِنَّ ذٰلِكَ نَصْرُهُ)) (بخاری) ’’تم اسے ظلم کرنے سے روک دو‘ کیونکہ یہی اس کی مدد ہے۔‘‘

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ١٠٤﴾ (آل عمران)

’’تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنا چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں‘ بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا کہ وہ معروف کا حکم کرتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ خیر امت کا اقتضا ہی یہ ہے‘ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ﴾

’’تم سب سے بہتر اُمت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہے‘ تم اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو۔‘‘

سورۃ التوبہ میں فرمایا: ﴿يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آیت ۷۱) ’’وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے منع کرتے ہیں‘‘۔ سورۂ لقمان میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو کی گئی یہ نصیحت نقل ہوئی: ﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آیت ۱۷) ’’اچھی بات کا حکم دو اور بری بات سے روکو!‘‘ سورۃ العصر میں اہل ایمان کی یہ تصویر اجاگر کی گئی: ’’اور وہ آپس میں سچائی اور ثابت قدمی کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں‘‘۔ سورۃ البلد میں بھی یہی مضمون بیان ہوا: ’’اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے رہے۔‘‘

قرآن پاک نے متعدد مقامات پر صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو



دوسروں کو ظلمتوں اور تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتے ہیں۔ برائی کے گڑھوں میں گرنے سے بچانا اور انہیں سہارا دینا اہل ایمان کی امتیازی شان ہے۔ سمجھانا بجھانا ان کا فرض بنتا ہے‘ زبردستی منوانا ان کی ذمہ داری نہیں: ﴿مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ﴾ (المائدۃ:۹۹) ’’رسول کا کام یہ ہے کہ فقط پیغام پہنچا دے‘‘۔ اگر یہ فرض ادا ہو جائے تو ان کے سر سے ذمہ داری اتر جاتی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ﴾ (المائدۃ:۱۰۵) ’’اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے۔ تم اگر سیدھے راستے پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا‘‘۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ آیۂ کریمہ پڑھی اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ’’لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکہ میں نہ ڈالیں‘ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ لوگ اگر ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ نہ پکڑ لیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔‘‘ (بحوالہ سیرت النبی ششم از سید سلیمان ندویؒ)

اگر لوگ برائی کو پھلتا پھولتا دیکھیں اور خاموش رہیں‘ ان کا ماتھا ذرا بھی شکن آلود نہ ہو تو برائی پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور پھر اس کا انجام ہولناک ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’جب بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کے کام کرنے لگے تو ان کے علماء نے انہیں روکا‘ لیکن وہ باز نہیں آئے‘ تو ان کے عالم (ان کا بائیکاٹ کرنے کے بجائے) ان کی مجلسوں میں بیٹھتے رہے اور ان کے ساتھ کھاتے پیتے رہے۔ جب ایسا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کے دل ایک جیسے کر دیے اور پھر حضرت داؤد اور عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کی زبان سے اللہ نے ان پر لعنت کی۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی راہ اختیار کی اور اسی میں بڑھتے چلے گئے۔ (عبداللہ بن مسعودؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں) فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ ٹیک لگائے بیٹھے تھے‘ پھر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ’’ہرگز نہیں‘ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے‘ تم ضرور لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے رہو گے اور برائیوں سے روکتے رہو گے اور ظالم کا ہاتھ پکڑو گے اور ظالم کو حق پر جھکاؤ گے۔ اگر تم لوگ ایسا نہیں کرو گے تو تم سب کے دل بھی ایک ہی طرح کے ہو جائیں گے اور پھر اللہ تم کو اپنی رحمت اور ہدایت سے دور پھینک دے گا جس طرح بنی اسرائیل کے ساتھ اس نے معاملہ کیا۔‘‘ (سنن الترمذی)

ایک دوسری حدیث میں جس کے راوی نعمان بن بشیرؓ ہیں‘ کے مطابق رسول اللہ ﷺ

نے ارشاد فرمایا:

’’وہ شخص جو اللہ کے احکام توڑتا ہے اور وہ جو اللہ کے احکام توڑتے ہوئے دیکھتا ہے مگر اسے ٹوکتا نہیں‘ اس کے ساتھ رواداری برتتا ہے‘ ان دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگوں نے کشتی لی اور قرعہ ڈالا۔ اس کشتی میں مختلف درجے ہیں‘ اوپر نیچے۔ چند آدمی اوپر کے حصہ میں بیٹھے اور چند نچلے حصہ میں۔ تو جو لوگ نچلے حصہ میں بیٹھے تھے وہ پانی کے لیے اوپر والوں کے پاس سے گزرتے تاکہ سمندر سے پانی بھریں تو اوپر والوں کو اس سے تکلیف ہوئی‘ آخر کار نیچے کے لوگوں نے کلہاڑی لی اور کشتی کے پیندے کو پھاڑنے لگے۔ اوپر کے لوگ ان کے پاس آئے اور کہا تم یہ کیا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں پانی کی ضرورت ہے اور سمندر سے پانی اوپر جا کر ہی بھرا جا سکتا ہے اور تم ہمارے آنے جانے والوں سے تکلیف محسوس کرتے ہو۔ تو اب کشتی کے تختوں کو توڑ کر ہم سمندر سے پانی حاصل کر لیں گے۔ حضور ﷺ نے یہ مثال بیان کر کے فرمایا: اگر اوپر والے نیچے والوں کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور سوراخ کرنے سے روک دیتے ہیں تو انہیں بھی ڈوبنے سے بچا لیں گے‘ اور اپنے کو بھی بچا لیں گے‘ اور اگر انہیں ان کی حرکت سے نہیں روکتے اور چشم پوشی اختیار کرتے ہیں تو انہیں بھی ڈبوئیں گے اور خود بھی ڈوبیں گے۔‘‘ (بخاری)

ایک مسلم معاشرہ جو اسلامی اصولوں کا نقیب ہو اس میں اہلِ ایمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اخلاقی حدود کی پاسبانی کرے بلکہ برائیوں کے استیصال کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں کام میں لائے اور اس امر پر نگاہ رکھے کہ برائی سر نہ اٹھانے پائے۔ برائی کو دیکھ کر چپ سادھ لینے اور برداشت کر لینے سے اس کا زہر پورے معاشرے میں سرایت کرتا جائے گا اور اس کے مہلک اثرات مرتب ہوں گے اور پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہو کر رہ جائے گا۔ عین ممکن ہے کہ وہ برائی معاشرے کی روایت بن کر رہ جائے اور پھر وہ معاشرہ اللہ کے عذاب سے بچ نہ سکے۔ فرمایا:

((مَا مِنْ قَوْمٍ يُعْمَلُ فِيهِمْ بِالْمَعَاصِي هُمْ اَعَزُّ وَاَكْثَرُ مِمَّنْ يَعْمَلُهُ فَلَمْ يُغَيِّرُوْهُ اِلَّا عَمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ)) (مسند احمد: ۳۶۴/۴)

’’جس قوم میں گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہو اور وہ قوم گناہ کرنے والوں سے قوت و تعداد میں زیادہ بھی ہو لیکن اس گناہ کو روکنے کی کوشش نہ کرے تو اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب کی لپیٹ میں لے لے گا۔‘‘

نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا ایک مؤمن کے ایمان کی علامت ہے‘ مگر اس کی انجام دہی میں حکمت و مصلحت کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ موقع کی مناسبت سے یہ ذمہ داری ادا کرنا



چاہیے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ گہرے حزم و احتیاط کا تقاضا کرتا ہے تاکہ فتنہ و فساد پیدا نہ ہونے پائے۔ داعی کا فرض ادا کرنے کے لیے قول و عمل میں یکسانیت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ نیکی کا حکم دے مگر اپنے آپ کو بھول جائے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نصیحت اور فہمائش خوش اسلوبی کے ساتھ کرے۔ آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (النحل)

’’آپ اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سے دعوت دیجیے!‘‘

سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (۶۳)﴾

’’پس آپ ان سے درگزر کیجیے اور ان کو نصیحت کیجیے اور ان سے خود ان کے بارے میں ایسی بات کہیے جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔‘‘

علامہ یوسف القرضاوی نے برائی کو طاقت سے روکنے کے لیے بعض شرائط بیان کی ہیں:

’’پہلی شرط یہ ہے کہ وہ برائی متفقہ طور پر حرام کاموں میں شامل ہو‘ یعنی وہ برائی حقیقتاً منکر ہو۔ اس سے مراد وہ برائی ہے جس کو اولاً ہاتھ کی طاقت سے‘ پھر زبان سے اور پھر دل سے روکنے کا مطالبہ کیا گیا ہے...... اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس برائی کے منکر ہونے پر سب کا اتفاق ہو...... دوسری شرط یہ ہے کہ منکر کا ارتکاب ظاہری ہو خفیہ نہ ہو‘ یعنی اس منکر کا ارتکاب ظاہر اور دیکھا جا سکنے والا ہو...... تیسری شرط یہ ہے کہ منکر کو روکنے کی بالفعل طاقت رکھتا ہو...... چوتھی شرط یہ ہے کہ کسی بڑی برائی کے پیدا ہونے کا خدشہ نہ ہو...... اور جب منکر کا ارتکاب حکومت کر رہی ہو تو پھر افراد اور جماعتیں پہلے اتنی قوت کی مالک بنیں جو برائی کو روک سکے۔‘‘☆

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

’’امن و امان قائم رکھنا امام کے ہاتھ میں ہے‘ اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوجدارانہ اور زبردستی کے تحکمانہ انتظامات جس کے لیے تنفیذی قوت درکار ہے صرف حکومت کا فرض ہے‘ تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کو روکنے کے لیے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے۔‘‘ (سیرت النبی جلد ششم)

☆ علامہ یوسف القرضاوی حفظہ اللہ کا محولہ بالا مضمون‘ ان شاء اللہ العزیز‘ میثاق کے آئندہ شمارے میں شائع کیا جائے گا۔ (ادارہ)

# نماز باجماعت کی اہمیت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

نماز پنجگانہ ایک اہم دینی فریضہ ہے‘ جس کی ادائیگی ہر عاقل بالغ مسلمان پر ضروری ہے۔ نماز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ قرآن مجید میں بار بار نماز قائم کرنے کا حکم ہے اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ’’مسلمان اور کافر میں فرق نماز کا ہے‘‘۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالت میں منافقین کو بھی نماز کی پابندی کرنا پڑتی تھی تاکہ انہیں مسلمان سمجھا جائے۔ چونکہ اسلام اجتماعیت پر زور دیتا ہے‘ لہٰذا اس کی تمام عبادات اجتماعیت کا مظہر ہیں۔ روزہ رمضان میں سب مسلمانوں پر لازم ہے۔ حج کے لیے تو دنیا جہاں کے مسلمان حرم شریف میں اکٹھے ہوتے اور مناسک حج ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح نماز کے لیے حکم ہے کہ جماعت کے ساتھ ادا کی جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ﴿۴۳﴾﴾ (البقرۃ)

’’نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔‘‘

یعنی نماز جماعت کے ساتھ ادا کیا کرو۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو سب سے پہلا کام جو آپ نے کیا وہ مسجد کی تعمیر تھی‘ تاکہ سب مسلمان مل کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کریں۔ قرآن مجید میں سورۃ النساء کی آیت ۱۰۲ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ خوف اور جنگ کی حالت میں بھی نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں۔ جب اس قدر غیر معمولی حالات میں بھی جماعت چھوڑنے کی اجازت نہیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ امن و امان اور معمول کے دنوں میں نماز کی جماعت چھوڑی جائے۔

پانچوں نمازوں کے لیے مسجد میں اذان دینے کا حکم ہے اور اذان کے الفاظ ہیں: **حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ‘ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ** یعنی نماز کی طرف چلے آؤ‘ فلاح کی طرف چلے آؤ! گویا یہ نماز کے لیے صرف ایک یاددہانی نہیں بلکہ خدائی بلاوا ہے کہ مسجد میں آ کر نماز پڑھو۔ جماعت



کے قیام کے لیے ضروری نہیں کہ بہت سے لوگ اکٹھے ہوں تو پھر نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جائے‘ بلکہ اگر صرف تین آدمی بھی موجود ہوں تو وہ نماز اکیلے اکیلے نہیں بلکہ باجماعت نماز ادا کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا کَانُوْا ثَلَاثَۃً فَلْیَؤُمَّھُمْ اَحَدُھُمْ‘ وَاَحَقُّھُمْ بِالْاِمَامَۃِ اَقْرَؤُھُمْ))

(صحیح مسلم)

’’جب وہ تین ہوں تو ان میں سے ایک ان کی امامت کروائے‘ اور ان میں امامت کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہے جو سب سے زیادہ قرآن پڑھنے والا ہے۔‘‘

اس حدیث میں تو تین افراد کی جماعت کا حکم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو سفر کا ارادہ کرنے والے دو اشخاص کو بھی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کا حکم دیا۔ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا اَنْتُمَا خَرَجْتُمَا فَاَذِّنَا ‘ ثُمَّ اَقِیْمَا ‘ ثُمَّ لِیَؤُمَّکُمَا اَکْبَرُکُمَا))

(صحیح البخاری)

’’جب تم دونوں نکلو تو اذان کہو‘ پھر اقامت کہو‘ پھر تم دونوں میں سے بڑی عمر والا تمہاری امامت کرائے۔‘‘

کوئی شخص اگر مسجد میں موجود ہو اور اذان ہو جائے تو ایسے شخص کو بلا عذر مسجد سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں‘ بلکہ اب وہ نماز باجماعت ادا کرے اور پھر مسجد سے باہر جائے‘ کیونکہ اذان دینے والا پکار رہا ہے کہ نماز کا وقت ہو چکا ہے اور اب نماز کی جماعت ہونے والی ہے تو اس اعلان کے سننے کے بعد بغیر نماز ادا کیے مسجد سے باہر نکل جانے کا کیا جواز ہوسکتا ہے؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا:

((اِذَا کُنْتُمْ فِی الْمَسْجِدِ ، فَنُوْدِیَ بِالصَّلَاۃِ ، فَلَا یَخْرُجْ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُصَلِّیَ ))

(مجمع الزوائد)

’’کہ جب تم مسجد میں ہو اور نماز کے لیے اذان ہو جائے تو تم میں سے کوئی نماز ادا کیے بغیر نہ نکلے۔‘‘

ایک حدیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اذان کے بعد مسجد سے نکلنے والے شخص کو منافق قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَسْمَعُ النِّدَاءَ فِیْ مَسْجِدِیْ ھٰذَا ، ثُمَّ یَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّا لِحَاجَةٍ ، ثُمَّ لَا یَرْجِعُ اِلَیْهِ ، اِلَّا مُنَافِقٌ)) (مجمع الزوائد والمعجم الأوسط للطبرانی)

''میری اس مسجد سے اذان سن کر بلاضرورت نکل کر واپس نہ آنے والا منافق ہی ہے۔''

نماز باجماعت ادا کرنا اس قدر ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک نابینا صحابی (حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم ؓ) کو جن کا گھر مسجد کے قریب نہ تھا اور ان کو مسجد لے جانے اور واپس لانے والا کوئی نہ تھا' ان کے متعدد عذروں کے باوجود گھر میں اکیلے نماز پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ ؓ کی روایت منقول ہے کہ ایک نابینا شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! بے شک مجھے مسجد میں لانے والا راہنما کوئی نہیں تو کیا آپؐ مجھے گھر میں ہی نماز پڑھنے کی اجازت دے دیں گے؟ آپ ﷺ نے انہیں اجازت دے دی۔ جب وہ (واپس جانے کی خاطر) مُڑے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں بلا کر فرمایا: ''کیا تم اذان سنتے ہو؟'' انہوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((فَاَجِبْ !)) ''سو تم اسے قبول کرو!'' یعنی باجماعت نماز ادا کرنے کی خاطر مسجد میں آیا کرو۔

بیماری کے سبب کوئی شخص مسجد میں نہ آسکے تو گھر پر نماز پڑھ لے۔ اس کا یہ عذر جائز ہے۔ مگر نبی اکرم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی کرتے ہوئے صحابہ کرام ؓ اور صالحینِ امت شدید بیماری میں بھی باجماعت نماز میں شمولیت کے لیے مسجد جانے کا اہتمام کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن بریدہ ؓ کہتے ہیں: ''بے شک میں نے دیکھا کہ ہم میں سے کھلے نفاق والے منافق کے سوا کوئی اور شخص (باجماعت) نماز سے پیچھے نہ رہتا۔ بلاشبہ (بیمار) آدمی کو دو آدمیوں کے سہارے لا کر صف میں کھڑا کیا جاتا۔'' (صحیح مسلم' کتاب المساجد)

حضرت عامر عبداللہ زبیر بن العوام ؓ کے بیٹے تھے۔ انہوں نے مؤذن کی آواز کو سنا' اُس وقت وہ جان کنی کے عالم میں تھے۔ فرمایا: ''میرا ہاتھ پکڑو (اور مجھے مسجد پہنچاؤ)''۔ عرض کیا گیا: بلاشبہ آپ بیمار ہیں۔ انہوں نے جواب دیا: ''اللہ کے بلاوے کو سنوں اور قبول نہ کروں (یہ کیسے ہوسکتا ہے)''۔ لوگوں نے ان کا ہاتھ تھاما اور وہ جا کر مغرب کی نماز میں امام کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ابھی ایک رکعت ہی پڑھنے پائے تھے کہ فوت ہو گئے۔ یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرنے کی اہمیت سے واقف تھے۔

سلف صالحین کا یہ طرزِ عمل ہمارے لیے مشعل راہ ہے کہ اگر اپنی قریبی مسجد میں کسی وجہ



سے نماز کی جماعت میں شامل نہ ہو سکتے تو اس غرض کے لیے دوسری مسجد میں چلے جاتے تاکہ وہاں جماعت مل جائے۔ حضرت اسود بن یزید بن قیس کے متعلق امام بخاری کہتے ہیں: ''جب ان کی (اپنی مسجد میں) جماعت رہ جاتی تو دوسری مسجد کی طرف چلے جاتے۔'' (صحیح البخاری)

اسی طرح کا طرزِ عمل حضرت حذیفہؓ اور سعید بن جبیرؒ اور دوسرے بہت سے صالحین سے ثابت ہے۔

مدنی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کو کئی جنگیں پیش آئیں۔ اللہ کے حکم کے مطابق وہاں بھی آپؐ نماز باجماعت کا اہتمام کرتے۔ رسول اللہ ﷺ کی سرکردگی میں صحابہ کرام نے جہینہ قبیلہ کے ایک گروہ کے خلاف جہاد کیا۔ گھمسان کی اس جنگ کے موقع پر بھی آپ ﷺ نے مجاہدین کو ظہر اور عصر کی نمازیں اپنے اپنے وقت پر جماعت کے ساتھ پڑھائیں' حالانکہ دشمن اس انتظار میں تھے کہ مسلمان نماز میں مشغول ہوں تو ان پر حملہ کر دیں۔ اسی طرح جب بھی میدانِ جنگ میں نماز کا وقت آیا آپؐ نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھائی۔ اور یہی دستور خلفائے راشدین ؓ کے دور میں رہا' کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر ہی عمل کرتے تھے۔

یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی آخری علالت کے ایام تھے' آپ ﷺ کمزوری کے باعث چل کر مسجد نہیں جا سکتے تھے۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: ''آپ دو آدمیوں کے سہارے اس طرح مسجد جا رہے تھے کہ آپؐ کے دونوں قدم مبارک زمین پر گھسٹتے ہوئے لکیریں لگا رہے تھے۔'' (صحیح البخاری)

نماز باجماعت کی تاکید آپ ﷺ نے اس درجہ کی کہ جماعت میں شامل نہ ہونے والوں پر آپؐ نے انتہائی درجے کی ناراضی کا اظہار فرمایا' حالانکہ آپ رحمۃٌ لِّلعالمین یعنی مجسّم رحمت و رأفت تھے' آپ ﷺ نے ایسے لوگوں کو ان کے گھروں سمیت جلانے کا مصمّم ارادہ فرمایا۔ حضرت ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' یقیناً میں نے پختہ ارادہ کیا کہ ایندھن جمع کیا جائے' پھر میں نماز کا حکم دوں تو اس کے لیے اذان دی جائے۔ پھر میں ایک شخص کو حکم دوں تو وہ لوگوں کی امامت کرائے' پھر میں (جماعت سے پیچھے رہ جانے والے) مَردوں کے پیچھے جاؤں اور ان کو ان کے گھروں سمیت جلا کر راکھ کر دوں۔'' (صحیح البخاری)

نماز باجماعت کی اس قدر تاکید اور جماعت چھوڑنے پر اس قدر وعید اس لیے ہے کہ نماز باجماعت حکمِ خدا اور سنتِ رسول ہے' اور کسی بندے کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم

کی نافرمانی کرے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے اعراض کرے۔ جب کوئی اللہ اور اس کے رسول کی رضا والے کام کرے تو اس کو بے حد اجر و ثواب کی خوشخبری بھی ہے۔ نماز باجماعت ادا کرنے پر بھی رسول اللہ ﷺ نے کئی بشارتیں سنائی ہیں۔ ایک صحابی کا گھر مسجد سے دُور تھا' اُس نے آپ ﷺ سے بات کی اور کہا کہ میں مسجد کے قریب رہائش لانا چاہتا ہوں' تو آپؐ نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ نماز کے لیے مسجد کی طرف جتنے قدم اٹھائے جائیں گے ان پر اجر و ثواب ہے' اسی طرح واپس آنے پر بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ مُتَطَهِّرًا اِلٰى صَلَاةٍ مَكْتُوْبَةٍ فَاَجْرُهٗ كَاَجْرِ الْحَاجِّ الْمُحْرِمِ)) (سنن ابی داؤد)

’’اپنے گھر سے اچھی طرح پاک صاف ہو کر فرض نماز کے لیے روانہ ہونے والے شخص کا اجر احرام باندھ کر حج کرنے والے شخص کے اجر کی مانند ہے۔‘‘

گویا دن میں پانچ نمازوں کے لیے چاہت اور رغبت کے ساتھ مسجد میں جانے والا کس قدر خوش بخت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بشارت کے مطابق ہر روز پانچ حج ادا کرنے کا ثواب پا رہا ہے۔

نماز باجماعت ایسا نورانی عمل ہے کہ اس کے بدلے میں روزِ حشر روشنی ملے گی۔ حضرت سہل بن سعد ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لِيُبَشَّرِ الْمَشَّاؤُوْنَ فِي الظُّلَمِ اِلَى الْمَسَاجِدِ بِنُوْرٍ تَامٍّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))
(سنن ابن ماجه)

’’تاریکیوں میں مسجدوں کی طرف بار بار جانے والوں کو روز قیامت کامل نور کی بشارت دے دو!‘‘

مسجد اللہ کا گھر ہے۔ جو شخص محض نماز باجماعت کی ادائیگی کے لیے گھر سے ارادہ کر کے نکلتا ہے تو وہ مسجد میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا مہمان ہوتا ہے۔ حضرت سلمان ؓ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان منقول ہے:

((مَنْ تَوَضَّاَ فِيْ بَيْتِهٖ ، فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ، ثُمَّ اَتَى الْمَسْجِدَ ، فَهُوَ زَائِرُ اللّٰهِ، وَحَقٌّ عَلَى الْمَزُوْرِ اَنْ يُكْرِمَ الزَّائِرَ))
(مجمع الزوائد والمعجم الکبیر للطبرانی)

’’جس شخص نے اپنے گھر میں اچھی طرح وضو کیا' پھر وہ مسجد آیا تو وہ اللہ تعالیٰ کا مہمان



ہے اور بے شک میزبان کے ذمہ مہمان کی تکریم کرنا لازم ہے۔‘‘

سبحان اللہ! جب میزبان اللہ تعالیٰ ہو تو مہمان کی تکریم کس درجہ کی ہو گی۔ جیسے وہ ذات پاک بے مثل اور بے مثال ہے اسی طرح اس کی میزبانی بھی برتر از وہم و خیال ہو گی۔ اے اللہ کریم ہمیں زندگی کے آخری دن تک نماز باجماعت کی سعادت نصیب کرنا اور اس کے نتیجے میں الٰہی میزبان ہونے کا شرف عطا کرنا۔ آمین!

نماز تو پھر ایک فضیلت والا عمل ہے' جماعت کھڑی ہونے سے قبل مسجد میں جا کر نماز کے انتظار میں بیٹھنا بھی کس قدر عظیم کام ہے! حضرت ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَحَدُكُمْ مَا قَعَدَ يَنْتَظِرُ الصَّلَاةَ فِيْ صَلَاةٍ ، مَا لَمْ يُحْدِثْ ، تَدْعُوْ لَهُ الْمَلَائِكَةُ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ)) (صحیح مسلم)

’’تم میں سے جب تک کوئی باوضو نماز کے انتظار میں رہے وہ نماز ہی میں ہوتا ہے۔ فرشتے اس کے لیے دعا کرتے ہیں: ’’اے اللہ اسے معاف فرما دیجیے' اے اللہ اس پر رحم فرمائیے!‘‘

فرشتے اللہ تعالیٰ کی نورانی اور معصوم مخلوق ہیں۔ ان پاکبازوں کی دعا ضرور شرف قبولیت پائے گی اور نماز کے انتظار میں مسجد میں جا کر بیٹھنے والوں کے لیے باعث سعادت ہو گی۔ ظاہر ہے جو شخص پاک صاف ہو کر قبل از وقت مسجد میں جا کر نماز کے انتظار میں بیٹھے گا وہ اللہ کے ذکر میں مشغول رہے گا اور اللہ کا ذکر خود بہت بڑی فضیلت کا باعث ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ ’’اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا عمل ہے۔‘‘

حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((اِنَّ اللّٰهَ لَيَعْجَبُ مِنَ الصَّلَاةِ فِي الْجَمِيْعِ)) (مجمع الزوائد والمعجم الکبیر للطبرانی)

’’بے شک اللہ تعالیٰ نماز باجماعت سے خوش ہوتا ہے۔‘‘

جس عمل سے اللہ خوش ہوتا ہے وہ عمل لازماً بندے کے گناہوں کی معافی کا سبب بنتا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

((مَنْ تَوَضَّاَ لِلصَّلَاةِ فَاَسْبَغَ الْوُضُوْءَ ، ثُمَّ مَشٰى اِلَى الصَّلَاةِ الْمَكْتُوْبَةِ،

فَصَلَّاهَا مَعَ النَّاسِ، اَوْ مَعَ الْجَمَاعَةِ، اَوْ فِی الْمَسْجِدِ غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ ذُنُوْبَہٗ))

(صحیح مسلم)

’’جس شخص نے نماز کے لیے وضو کیا‘ تو کامل وضو کیا‘ پھر فرض نماز کی خاطر چلا اور اسے لوگوں کے ساتھ‘ یا جماعت کے ساتھ‘ یا مسجد میں ادا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہوں کو معاف فرما دیا۔‘‘

گناہ کے کام تو پوری احتیاط کے باوجود بھی انسان سے ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے نماز اور جماعت کی توفیق ملی ہے تو اس کے گناہوں کی بخشش بھی ہو رہی ہے۔ یہ بڑی خوش بختی ہے۔

آج ہم اپنے اردگرد دیکھیں تو افسوس صد افسوس‘ مسلمانوں کی بھاری اکثریت نماز سے غافل ہے۔ یہ لوگ اپنی دنیوی مصروفیتوں اور کاروبار میں بہت چست‘ ماہر‘ سمجھ دار اور سیانے ہیں‘ لیکن بدقسمت ہیں کہ ان کی زندگی کے قیمتی اوقات اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی میں گزر رہے ہیں اور یہ آخرت کے حساب کتاب سے بے خبر ہیں۔ حضرت ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

((اِنَّ اَوَّلَ مَا یُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنْ عَمَلِهٖ صَلَاتُهٗ ، فَاِنْ صَلُحَتْ فَقَدْ اَفْلَحَ وَاَنْجَحَ وَاِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ......))

(رواہ الترمذی والنسائی)

’’قیامت کے روز بندے سے اُس کے اعمال میں سے سب سے پہلے نماز کے بارے میں محاسبہ کیا جائے گا‘ پس اگر یہ درست ہوئی تو وہ کامیاب وکامران ہوگا اور اگر یہ خراب ہوئی تو وہ ناکام ونامراد ہوگا......‘‘

جب نماز کے بارے میں پوچھا جائے گا تو بے نماز مسلمانوں کے پاس کیا جواب ہوگا؟ کیا نماز اہم ترین فریضہ نہیں ہے جس کا ذکر بار بار قرآن مجید میں آیا ہے اور جس کی تاکید رسول اللہ ﷺ نے قول وفعل سے واضح کی ہے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے نماز کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

’’جو بندہ نماز اہتمام کے ساتھ ادا کرے گا وہ قیامت کے دن اس کے واسطے نور ہوگی اور دلیل ہوگی اور اس کے لیے نجات کا ذریعہ بنے گی‘ اور جس نے نماز کی ادائیگی کا اہتمام نہیں کیا تو وہ اس کے واسطے نہ نور بنے گی نہ برہان اور نہ ذریعہ نجات۔ اور وہ

(باقی صفحہ 84 پر)

# مسعود اقبال مرحوم ۔ صاحبِ قلبِ سلیم

پروفیسر خورشید عالم

قلبِ سلیم (sound heart)۔لفظ سلیم کی مصدر سَلامة اور فعل سَلِمَ ہے۔ سلیم' سلامة سے صفت مشبہ ہے۔ابن فارس معجم المقاییس میں کہتے ہیں کہ سین' لام اور میم زیادہ تر صحت وعافیت کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور سلامة سے یہ مراد ہے کہ انسان آفت اور تکلیف سے محفوظ رہے۔امام راغب مفردات میں فرماتے ہیں کہ ''سلم اور سلامة کے معنی ظاہری اور باطنی آفتوں سے پاک ہونا ہے اور قلبِ سلیم سے مراد ایسا دل ہے جو دغا اور کھوٹ سے پاک ہو' یہ سلامت باطنی کے بارے میں ہے''۔امام رازی نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ ''انسانی جسم میں جب مزاج اور ترکیب میں سے ہر دو موجود ہوں تو کہا جاتا ہے کہ جسم تندرست ہے اور جب جسم میں مزاج اور ترکیب میں سے کوئی ایک زائل ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ جسم مریض ہے۔اسی طرح دل میں جب علم اور اخلاق فاضلہ دونوں موجود ہوں تو اس دل کو قلب سلیم کہا جاتا ہے اور جب ان میں سے کوئی ایک زائل ہو جائے تو اسے روگی دل کہا جاتا ہے۔پس جس کا دل سلیم ہوگا اس کی زبان اور جوارح بھی سلیم ہوں گے''۔مؤمن کا دل بے روگ ہوتا ہے اور منافق کا دل روگ والا۔

عربی زبان میں قلب سے مراد دل بھی ہے اور دماغ بھی۔جس طرح قلب احساسات و جذبات کا مرکز ہے اسی طرح وہ عقل وبصیرت کا مرکز بھی ہے۔اس اعتبار سے وہ انسان کے پورے کردار کی نمائندگی کرتا ہے۔امام رازی فرماتے ہیں کہ ''قلبِ سلیم کے بارے میں اہل اصول کا قول ہے کہ فلاں آدمی پاکیزہ دل سے جیا اور پاکیزہ دل سے مرا' یعنی وہ تمام گناہوں کی آلائشوں سے پاک رہا۔ان آلائشوں میں شرک' شک وشبہ' دغا اور کھوٹ' کینہ اور حسد سب شامل ہیں۔حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ: ''وہ (صاحبِ قلبِ سلیم) لوگوں کے لیے بھی وہی پسند کرتا تھا جو اپنی ذات کے لیے پسند کرتا تھا' چنانچہ لوگ اس کے مکروفریب اور



جور وستم سے محفوظ رہے اور اللہ نے اسے بھی محفوظ رکھا اور اس کے برابر کسی کو قرار نہیں دیا۔''

سلیم کا لفظ مطلق ہے۔اسے دوسرے اوصاف کو چھوڑ کر صرف ایک وصف کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔قلبِ سلیم کی تعریف عام فہم انداز میں سورۃ الصافات کی آیت ۸۴ کے تحت مولانا مودودیؒ نے یوں کی ہے:

> ''قلبِ سلیم کے معنی صحیح سلامت دل کے ہیں' یعنی ایسا دل جو تمام اعتقادی اور اخلاقی خرابیوں سے پاک ہو' جس میں کفر وشرک اور شکوک وشبہات کا شائبہ تک نہ ہو' جس میں نافرمانی اور سرکشی کا کوئی جذبہ نہ پایا جاتا ہو' جس میں کوئی اینچ پیچ اور الجھاؤ نہ ہو! جو ہر قسم کے برے میلانات اور ناپاک خواہشات سے بالکل صاف ہو' جس کے اندر کسی کے لیے بغض وحسد یا بدخواہی نہ پائی جاتی ہو' جس کی نیت میں کھوٹ نہ ہو۔''

یقیناً ایسا دل میرے ساتھی اور میرے دوست مسعود اقبال کا تھا۔

قرآن حکیم میں قلبِ سلیم کی ترکیب صرف دو مقامات پر وارد ہوئی ہے۔ایک تو سورۃ الشعراء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٩﴾﴾ ''جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے۔ہاں جو شخص اللہ کے پاس بے روگ دل لے کر آئے گا (وہ بچ جائے گا)''۔اور سورۃ الصافات میں ارشاد ہے: ﴿اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٤﴾﴾ ''جب وہ اپنے پروردگار کے پاس بے روگ دل لے کر آیا''۔ دونوں آیات کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے۔پہلی آیت میں قلبِ سلیم کو مال واولاد کے مقابلے میں پیش کیا گیا ہے' کیونکہ مال اور اولاد کی محبت کی وجہ سے دل کو روگ لگ جاتا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ جب کسی سے پوچھا جاتا ہے کیا تمہارے پاس مال اور اولاد ہے؟ تو وہ کہتا ہے کہ میرے پاس نہ مال ہے نہ اولاد ہے' ہاں قلبِ سلیم ہے۔مراد مال اور اولاد کی نفی اور قلبِ سلیم کا اثبات ہوتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ روزِ حساب نہ مال ودولت کام آئیں گے نہ اہل وعیال' مگر وہ ضرور کامیاب ہوگا جس کے پہلو میں قلبِ سلیم ہوگا۔دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صاحبِ قلبِ سلیم کے لفظ سے نوازا ہے۔مراد اللہ تعالیٰ کی طرف ان کی پوری یکسوئی اور ان کا کمال صدق واخلاص ہے۔سید قطب فرماتے ہیں کہ ''یہ قرآن کی بہت ہی سادہ' آسان اور واضح تعبیر ہے۔اس میں طہارت وپاکیزگی' اخلاص اور استقامت کی تمام صفات ایک ساتھ جمع کر دی گئی ہیں۔اسی قلبِ سلیم کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے فعل کو بُرا سمجھا۔''

ہمارے یہاں اردو میں قلبِ سلیم (sound heart)، عقلِ سلیم (sound mind) اور ذوقِ سلیم (sound good taste) کی تراکیب کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔ اس گئے گزرے معاشرے میں بھی کیا ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کے پہلو میں قلبِ سلیم ہو؟ ہاں پائے جاتے ہیں! مجھے اس کا احساس مرحوم مسعود اقبال کی رفاقت میں ہوا۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ میں اور مسعود اقبال ایک ہی دن یعنی ۷ دسمبر ۱۹۹۶ء کو قرآن کالج کے سٹاف میں شامل ہوئے۔ مسعود اقبال اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے ۱۹۸۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات اور ۱۹۸۴ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ قلبِ سلیم کی پہلی علامت یہ ہے کہ قانون کی پریکٹس کو چھوڑ کر انہوں نے درس وتدریس کو ترجیح دی' جہاں ان کی تنخواہ ۳۵۰۰/- روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ میں نے اس اللہ کے بندے کے منہ سے مالی تنگدستی کا کبھی کوئی شکوہ نہیں سنا۔

قرآن کالج میں میرا اور ان کا ساتھ دس برس تک رہا' کیونکہ ۲۰۰۶ء میں مجھے کالج سے فارغ کر دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی کالج میں میرا آنا جانا لگا رہا۔ اگر میں کہوں کہ میں کالج میں صرف مسعود اقبال کو ملنے جاتا تھا تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ جس صبح مجھے ان کی وفات کی خبر ملی' میں کالج گیا' گیٹ پر تالہ پڑا ہوا تھا۔ چوکیدار جو نیا تھا اس نے دروازہ کھولا اور پوچھا کہ کس سے ملنا ہے؟ میں نے کہا کہ جس سے ملنا تھا وہ تو چلا گیا' اب میں کیا بتاؤں کہ کس سے ملنا ہے!

میرا اور مسعود کا مسلسل سولہ برس ساتھ رہا۔ وہ میرا دوست تھا' مگر ناصح دوست نہیں' بلکہ بقولِ غالب میرا چارہ ساز تھا اور غمگسار تھا۔ کالج چھوڑنے کے بعد بارہا ایسا ہوا کہ کسی مسئلے نے مجھے پریشان کیا۔ سخت ذہنی تناؤ کی حالت میں میں نے کالج کا رخ کیا۔ مسعود نے کھلے بازوؤں سے میرا استقبال کیا۔ میں ان کے پاس بیٹھا' چائے پی' گپ شپ لگائی اور میری ساری پریشانی جاتی رہی اور میں پُرسکون ہو کر گھر لوٹ آیا۔ مجھے یہ احساس ہوتا کہ وہ میرے دکھ سکھ میں شریک ہے۔ وہ میرا پہلا اور آخری بے تکلف دوست تھا۔ میں ترپن برس تک درس وتدریس سے وابستہ رہا ہوں' بہت سے دوست ملے' مگر اس جیسا نہ ملا' کیونکہ وہ میرا مزاج دان تھا۔

مجھ کو اپنے مزاج داں نہ ملے
دوست ورنہ کہاں کہاں نہ ملے!

وہ میرا مذاق اڑاتا اور میں اس کا مذاق اڑاتا۔ کئی دفعہ میں تلخ بات کہہ دیتا جسے وہ میرا بزرگی کا



حق سمجھ کر ہنس کر ٹال دیتا۔ غصہ تو دور کی بات ہے میں نے انہیں کبھی کسی سے ناراض ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ سیدھے سادے نیک نیت اور صاف دل انسان تھے۔ ہنس مکھ' ہلکے پھلکے مزاج کے۔ ہر ایک کی خیر ہر ایک کا بھلا چاہنے والے۔ دورانِ گفتگو اُن کے مزاح کی رگ پھڑکتی رہتی تھی۔ ان کی وفات کے دو چار روز بعد کا واقعہ ہے کہ میں بستر پر لیٹا ایک ذاتی مسئلے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ خیال آیا ابھی مسعود کے پاس جا کر بات کرتا ہوں۔ پھر ہوش آیا کہ مسعود تو چلا گیا۔ وہاں چلا گیا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آتا۔ ان کے جانے کے بعد مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ عربی کا ایک شعر کہتا ہے ؎

ذهب الّذين احبّهم     وبقيتُ مثل السَّيف فردا

''جن سے میں پیار کرتا تھا وہ چلے گئے' اب میں ایسے تنہا رہ گیا ہوں جس طرح تلوار اپنے نیام میں تنہا ہوتی ہے۔''

اب میں ایسا کہاں سے لاؤں جسے مسعود جیسا کہوں!

مسعود صرف میرا ہی دوست نہ تھا' وہ قرآن کالج کے چھوٹے ملازم سے لے کر بڑے ملازم سب کا دوست تھا۔ انسانی روابط کو قائم رکھنا اس کا خاصہ تھا۔ کالج چھوڑنے کے بعد بھی لوگوں کے تعلقات اس کے ساتھ قائم رہتے تھے۔ وہ ایسے انسان تھے جن سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔ بقول نبی کریم ﷺ ''اچھے انسان کی نشانی یہ ہے کہ اسے ملنے کو جی چاہتا ہے''۔ کالج کے پڑوس میں کالج کے ایک پرانے استاد رہتے ہیں' نام ان کا شاہ مبین الحق ہے' وہ انجینئرنگ یونیورسٹی کے شعبہ الیکٹرسٹی کے سربراہ تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے قرآن کالج میں ریاضی پڑھا کر پڑوس کا حق ادا کیا۔ وہ آج کل صاحبِ فراش ہیں۔ مسعود اقبال ہر دوسرے تیسرے روز ان کی تیمارداری کو جاتے رہتے تھے اور مجھے بھی بتاتے رہتے تھے۔ مجھے آج تک ان کی تیمارداری کی توفیق نہیں ہوئی۔ یہی فرق ہے مجھ میں اور مسعود اقبال میں۔ زمین و آسمان کا فرق' کیونکہ وہ صاحبِ قلبِ سلیم تھے' جو میں نہیں۔ جو لوگ کالج سے چلے گئے ہیں وہ جب بھی کالج آتے تھے تو سب سے پہلے مسعود اقبال کا پوچھتے تھے۔

اس کالج میں ان کا ایک کارنامہ سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے اور کالج کا ہر فرد ان کی اس خوبی کا گواہ ہے۔ جانے کتنے نادار طلبہ کو وہاڑی سے لا کر کالج میں داخل کیا۔ ان کی کالج فیس اور ہاسٹل کی فیس کا بندوبست مسعود اقبال کرتے تھے۔ ان کے لیے پیسوں کا بندوبست

کرنے کے لیے اگر ان کو مخیّر حضرات کے گھر کے سات چکر بھی لگانے پڑتے تو وہ گریز نہیں کرتے تھے۔ ایسے کتنے ہی طالب علم محض ان کی کاوشوں کی وجہ سے اچھے اچھے مناصب پر فائز ہوئے۔ صرف یہی ایک کام ان کے لیے جنت کا ضامن ہے۔ جب میری نظر ان کے جسد خاکی پر پڑی تو میرے اندر سے ایک صدا نکلی: کاش! ان کی جگہ میں مر جاتا اور یہ جیتے رہتے تاکہ بہت سے مستحق اور نادار بچے اپنی تعلیم مکمل کر پاتے۔ وہ قرآن کالج کا قیمتی اثاثہ تھے۔ انہوں نے دل و جان سے خدمت کر کے قرآن کالج پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ جب تک یہ کالج چلتا رہے گا مسعود اقبال کا ذکرِ خیر ہوتا رہے گا۔

نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد جب میں نے ان کے پُرسکون چہرے کو دیکھا تو معاً میں نے سورۃ الفجر کی یہ آیات پڑھیں:

﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾﴾

جو انسان دوسرے انسانوں کی حاجات پوری کرتا رہا‘ جو اپنے مفاد کو دوسروں کے مفادات کی خاطر قربان کرتا رہا‘ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اللہ اس کا ہاتھ نہ تھامے۔ اپنے محدود وسائل کے وصف اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ بچیاں اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ بچہ برسرِ روزگار ہے۔ نیا مکان بنوایا‘ بچے کی شادی ہوئی اور اللہ نے پوتا دیا۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے پاس بلا لیا کہ اب تمہارا مشن پورا ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اللہ کے جوارِ رحمت میں ہیں۔ اللہ ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے‘ آمین!

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

خورشید عالم

مسعود اقبال سے بچھڑا ہوا

ایک دوست

❁ ❁ ❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

# ”جب زندگی شروع ہوگی“

## گمراہ کن تصورات کی تبلیغ‘ شاطرانہ اسلوب میں

انجینئر حافظ نوید احمد

پچھلے دنوں کئی سادہ لوح دوستوں نے ابویحییٰ کی تحریر کردہ کتاب ”جب زندگی شروع ہوگی“ کے مطالعہ کی طرف متوجہ کیا۔ اُن کی رائے تھی کہ مصنف نے میدانِ حشر کا منظر متعلقہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ مبارکہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑے دلچسپ انداز میں ناول کی صورت میں پیش کیا ہے۔ میدانِ حشر اور جہنم میں مختلف جرائم کا ارتکاب کرنے والوں پر ہولناک عذابوں کا ذکر بلاشبہ ہلا دینے والے پیرائے میں کیا گیا ہے۔ ناول کا یہ اسلوب سادہ لوح لوگوں کے لیے انتہائی متاثر کن ہے۔ کتاب کا مطالعہ کیا تو آغاز ہی سے محسوس ہوگیا کہ حق کے پردے میں باطل تصورات کی تبلیغ بڑی مہارت کے ساتھ کی گئی ہے۔ بڑے غیر محسوس طریقہ پر گمراہ کن تصورات ذہنوں میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اِس کوشش کے مختلف مظاہر حسبِ ذیل ہیں:

**(۱) اپنی شناخت کو چھپانا:** کتاب کے مصنف نے قارئین پر اپنی اصل شناخت ظاہر نہیں کی۔ موصوف کا نام ہے ریحان احمد یوسفی۔ موصوف جاوید احمد غامدی صاحب جیسے ”روشن خیال“ دانشور کے فعال ساتھی ہیں اور اُنہوں نے کتاب میں جاوید احمد غامدی صاحب کے گمراہی پر مبنی تصورات کو شاطرانہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اُنہیں شاید یہ اندیشہ تھا کہ اگر اپنا اصل نام ظاہر کر دیا تو جاوید احمد غامدی صاحب سے تعلق کی وجہ سے اُن کی کتاب کو قبولِ عام حاصل نہ ہوگا۔ لہٰذا مصنف نے ابویحییٰ کے نام سے کتاب تحریر کی ہے۔ یہ طرزِ عمل دیانت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے۔

**(۲) سپر پاور کی غلامی پر راضی رہنے کا درس:** کتاب میں عبداللہ نامی کردار کی زبانی میدانِ حشر میں برپا ہونے والے مختلف واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ عبداللہ کو ایک ایسے نیک سیرت کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو مقربین میں سے ہے اور اُس کی بخشش بغیر حساب کتاب کے ابتدا ہی میں ہوچکی ہے۔ دنیا میں اُس کے ساتھ موجود نیکی کا فرشتہ ”صالح“ اُسے میدانِ حشر میں مختلف مقامات پر لے جا رہا ہے۔ اس دوران ایک موقع پر عبداللہ بیان کرتا ہے:



”ہم چلتے ہوئے ایک شاندار خیمے کے قریب پہنچے۔ اِس کے دروازے پر ایک انتہائی باوقار اور پُرنور چہرے والے ایک صاحب کھڑے تھے۔ یہ میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ قریب پہنچ کر صالح نے اُن سے میرا تعارف کرایا:

یہ عبداللہ ہیں۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی امت کے آخری دور کے امتی۔ اور آپ نحور ہیں‘ یرمیاہ نبی کے قریبی ساتھی۔ نحور‘ آپ انہی سے ملنا چاہ رہے تھے نا؟

یہ ایک عظیم پیغمبر کے صحابی کا مجھ سے تعارف بھی تھا اور یہ وضاحت بھی کہ میں یہاں کیوں موجود ہوں۔

میں نے نحور سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا‘ لیکن اُنہوں نے پُرجوش انداز میں مجھے اپنے گلے سے لگالیا۔ میں نے اِسی حال میں اُن سے کہا:

”یرمیاہ نبی سے ملاقات کا شرف تو مجھے ابھی تک حاصل نہیں ہوا لیکن آپ سے ملنا بھی کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ یرمیاہ نبی کے حالات اور زندگی میں میرے لیے ہمیشہ بڑی رہنمائی رہی۔ مجھے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔“

یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں بنی اسرائیل کے اس عظیم پیغمبر کی زندگی گھوم رہی تھی۔ چھٹی صدی قبلِ مسیح میں بنی اسرائیل بدترین اخلاقی انحراف کا شکار تھے اور اسی بنا پر اپنے زمانے کی سپر پاور عراق کے حکمران بخت نصر کے ہاتھوں سیاسی مغلوبیت کے خدائی عذاب میں مبتلا ہو چکے تھے۔ مگر ان کے لیڈروں نے قوم کی اصلاح کرنے کے بجائے ان کے ہاں سیاسی غلبے کی سوچ عام کردی۔ یرمیاہ نے بنی اسرائیل کو ان کی اخلاقی اور ایمانی گمراہیوں پر متنبہ کیا اور انہیں سمجھایا کہ وقت کی سپر پاور سے ٹکرانے کے بجائے اپنی اصلاح کریں۔ مگر اُن کی قوم نے اپنی اصلاح کرنے کے بجائے اُنہیں کنویں میں الٹا لٹکا دیا اور پھر بخت نصر کے خلاف بغاوت کردی۔ اس کے بعد بخت نصر عذابِ الٰہی بن کر نازل ہوا اور اُس نے یروشلم (بیت المقدس) کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ چھ لاکھ یہودی قتل ہوئے اور چھ لاکھ کو وہ غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔“ (صفحات: ۶۰۔۶۲)

غور کیجیے کہ عبداللہ کو ایک ایسے نبیؑ سے ملنے کا اشتیاق ہے جن کا قرآنِ حکیم میں ذکر تک نہیں اور نہ ہی کسی معروف روایتِ حدیث میں تذکرہ ہے۔ عبداللہ کو اِن نبی کا یہ وصف پسند آیا ہے کہ اُنہوں نے قوم کو خانقاہی طرزِ عمل اختیار کرنے کی تلقین کے طور پر سپر پاور سے ٹکرانے کے بجائے ذاتی اصلاح کی طرف متوجہ کیا۔ سپر پاور کی غلامی سے نجات حاصل کرنے والوں کی غیرت مندانہ جدوجہد کو سیاسی غلبہ کی کاوش قرار دیا۔ عبداللہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملنے کا شوق پیدا نہیں ہوا جن کا قرآنِ حکیم میں بار بار ذکر آیا ہے اور اُنہیں نبوت پر سرفراز ہوتے ہی وقت کی سپر پاور فرعون سے ٹکرانے کا حکم دیا گیا تھا۔ عبداللہ کی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کی خواہش نہ تھی کہ جن کے اسوہ

کی پیروی کا قرآن نے حکم دیا ہے۔ جنہوں نے نمرود کے بھرے دربار میں کلمۂ حق کہہ کر اُس کی جھوٹی خدائی کا انکار کیا اور بت پرستی کے پیشواؤں سے سرعام تصادم مول لیا۔ بلاشبہ اُن پیغمبروں نے قوموں کو ذاتی اصلاح کی دعوت بھی دی لیکن اِس کے ساتھ ساتھ وقت کی ظالم قوتوں کے خلاف کلمۂ جہاد بھی بلند کیا۔ قوم کے دلوں میں ظالموں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکاتے رہے اور مناسب قوت فراہم ہوتے ہی میدان میں آ کر ظالم قوتوں سے ٹکرا گئے۔ سورۂ آل عمران میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ١٤٦﴾

’’اور کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر جنگ کی ہے کئی اللہ والوں نے۔ پھر نہ تو انہوں نے بزدلی دکھائی اس پر جو کچھ بھی (مصیبتیں) آئیں ان پر اللہ کی راہ میں‘ نہ ہی وہ کمزور پڑے‘ اور نہ ہی وہ باطل کے سامنے دبے۔ اور اللہ ایسے صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔‘‘

ایک اور موقع پر عبداللہ بیان کرتا ہے:

’’جس وقت حضرت یرمیاہ کی بعثت ہوئی‘ بنی اسرائیل اس دور کی عظیم سپر پاور عراق کی آشوری سلطنت اور اس کے حکمران بخت نصر کے باج گزار تھے۔ اس دور میں بنی اسرائیل کا اخلاقی زوال اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ ان میں شرک عام تھا‘ زنا معمولی بات تھی۔ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ یہ لوگ بدترین ظلم و ستم کا معاملہ کرتے۔ سود خوری اور غلامی کی لعنتیں عام تھیں۔ ایک طرف اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف سیاسی امنگیں عروج پر تھیں۔ ہر طرف بخت نصر کے خلاف نفرت کا طوفان اٹھایا جا رہا تھا۔ ان کے مذہبی اور سیاسی لیڈروں کی ساری توجہ اس بات کی طرف تھی کہ اس سیاسی محکومی سے نجات مل جائے۔ قوم کی اصلاح‘ اخلاقی تعمیر‘ ایمانی قوت جیسی چیزیں کہیں زیر بحث نہ تھیں۔ مذہب کے نام پر ظواہر کا زور تھا۔ ایمان و اخلاق اور عمل صالح کی کوئی وقعت نہ تھی۔

ایسے میں حضرت یرمیاہ اٹھے اور انہوں نے پوری قوت کے ساتھ ایمان و اخلاق کی صدا بلند کی۔ انہوں نے اہلِ مذہب اور اہلِ سیاست کو ان کے رویے پر تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کی اخلاقی کمزوریوں‘ شرک اور دیگر جرائم پر انہیں تنبیہ کی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنی قوم کو سختی سے اس بات پر متنبہ کیا کہ وہ بخت نصر کے خلاف بغاوت کا خیال دل سے نکال دیں۔ انہیں سمجھایا کہ جذبات میں آ کر انہوں نے اگر یہ حماقت کی تو بخت نصر قہر الٰہی بن کر ان پر نازل ہو جائے گا‘ مگر ان کی قوم باز نہ آئی۔ اس نے اُنہیں کنویں میں الٹا لٹکا دیا اور پھر جیل میں ڈال دیا۔ اِس کے ساتھ انہوں نے بخت نصر کے خلاف بغاوت کی جس کے نتیجے



میں بخت نصر نے حملہ کیا۔ چھ لاکھ یہودیوں کو اس نے قتل کیا اور چھ لاکھ کو غلام بنا کر ساتھ لے گیا۔ یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ پورا شہر خاک و خون میں بدل گیا۔ قرآنِ مجید نے اس واقعے کو بیان کیا اور یہ بتایا کہ حملہ آور لوگ دراصل قہر الٰہی تھے کیونکہ بنی اسرائیل نے زمین پر فساد مچا رکھا تھا۔

میں اسی سوچ میں تھا کہ صالح نے غالباً میرے خیالات پڑھ کر کہا:

ٹھیک یہی کام تمہارے زمانے میں تمہاری قوم کر رہی تھی۔ وہ علم‘ تعلیم‘ ایمان‘ اخلاق میں بدترین پستی کا شکار تھی‘ مگر اس کے نام نہاد رہنما اسے یہی سمجھاتے رہے کہ ساری خرابی وقت کی سپر پاورز اور ان کی سازشوں کی وجہ سے ہے۔ ایمان و اخلاق کی اصلاح کے بجائے سیاسی غلبہ اور اقتدار ہی ان کی منزل بن گیا۔ ملاوٹ‘ کرپشن‘ ناجائز منافع خوری‘ منافقت اور شرک قوم کے اصل مسائل تھے۔ ختم نبوت کے بعد ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ دنیا بھر میں اسلام کا پیغام پہنچاتے‘ مگر ان لوگوں نے قوم کی اصلاح اور غیر مسلموں کو اسلام کا پیغام پہنچانے کے بجائے غیر مسلموں سے نفرت کو اپنا وطیرہ بنا لیا۔ ان کے خلاف جنگ و جدل کا محاذ کھول دیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے بنی اسرائیل نے اپنی اصلاح کرنے کے بجائے بخت نصر کے خلاف محاذ کھولا تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی طرح انہوں نے بھی اس عمل کا برا نتیجہ بھگت لیا۔‘‘ (صفحات: ۱۹۷۔۱۹۹)

جو رہنما قوم کو ذاتی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں کر رہے وہ ایک انتہا پر ہیں‘ لیکن جو دانشور صرف ذاتی اصلاح ہی کی دعوت دیتے رہتے ہیں وہ دوسری انتہا پر ہیں۔ اعتدال کی راہ تو یہ ہے کہ لوگوں کو ذاتی اصلاح کی طرف متوجہ کیا جائے لیکن ان کے دل میں جبر اور استحصال کرنے والے ظالموں کے خلاف نفرت کو پکایا جائے۔ پھر جیسے ہی مناسب ایمانی و مادی قوت فراہم ہو جائے ظالموں اور سرکشوں کو بزورِ قوت ظلم اور زیادتی سے روک دیا جائے۔ یہی قرآن کی تعلیم اور نبی اکرم ﷺ کی سنت ہے۔ مکی دور میں حکم تھا کہ ہاتھوں کو بندھا رکھو‘ حق کی دعوت دیتے رہو اور برائی کا جواب اچھائی سے دو۔ نماز اور زکوٰۃ کی عبادات ادا کر کے ذاتی اصلاح کرتے رہو۔ مدنی دور میں پہلے ظالموں کے خلاف اقدام کی اجازت دی گئی اور بعد میں قتال کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

**(۳) شرعی پردے کی نفی:** آگے چل کر صالح میدانِ حشر میں عبداللہ کو دنیا کی زندگی میں ہونے والے ایک واقعہ کا منظر دکھاتا ہے۔ اس منظر میں عبداللہ شائستہ نامی ایک لڑکی کو دیکھتا ہے جو اپنے خاندان کی واحد کفیل ہے۔ وہ دونوں چھوٹی بہنوں کی شادی کا انتظام کرتی ہے اور خود والدین کی خدمت کے لیے شادی نہیں کرتی۔ عبداللہ کی تحریر کردہ کتابوں سے اُسے مشکل حالات میں بھی صبر و رضا کی کیفیت حاصل ہوئی ہے۔ اب ذرا میدانِ حشر میں عبداللہ کی شائستہ سے ملاقات کی داستان پڑھیے:

''میں اسی سوچ میں تھا کہ نحور نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا:
''ان شاء اللہ ان سے بھی جلد ملاقات ہو جائے گی' مگر سر دست تو میں آپ کو کسی اور سے ملوانا چاہتا ہوں''۔ یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے الگ ہوئے اور خیمے کی طرف رخ کر کے کسی کو آواز دی:
''ذرا باہر آنا! دیکھو تو تم سے کون ملنے آیا ہے؟''
نحور کی آواز کے ساتھ ہی ایک لڑکی خیمے سے نکل کر ان کے برابر آ کھڑی ہوئی۔ یہ لڑکی اپنے حلیے سے کوئی شہزادی اور شکل وصورت میں پرستان کی کوئی پری لگ رہی تھی۔ اس لڑکی نے گردن جھکا کر مجھے سلام کیا اور مجھے مخاطب کر کے کہا:
''آپ مجھے نہیں جانتے' مگر میرے لیے آپ میرے استاد ہیں اور اس رشتے سے میں آپ کی روحانی اولاد ہوں۔ میرا نام شائستہ ہے۔ گمراہی کے اندھیروں میں خدا کے سچے دین کی روشنی میں نے آپ کے ذریعے سے پائی تھی۔ خدا سے میرا تعارف آپ نے کرایا تھا۔ خدا کے ساتھ انسان کا اصل تعلق کیا ہونا چاہیے' یہ میں نے آپ ہی سے سیکھا تھا۔ آج دیکھیے! خدا نے مجھ پر احسان کیا اور اب میں ایک عظیم نبی کے صحابی کی بیوی بننے جا رہی ہوں۔''
تھوڑی دیر قبل صالح نے اسی لڑکی کو مجھے دکھایا تھا' مگر اب اس کی حالت میں جو انقلاب آ چکا تھا اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ لیکن اسے اس طرح دیکھ کر مجھے جتنی خوشی ہوئی' اس کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے شائستہ سے کہا:
''میری طرف سے آپ دونوں دلی مبارکباد قبول کیجیے۔ امید ہے کہ آپ مجھے اپنی شادی میں بھی یاد رکھیں گی۔''
''کیوں نہیں۔ آپ کو تو بلانے کا مقصد ہی نحور کو یہ بتانا تھا کہ میرے میکے والے کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں''۔ اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔
''پھر تو آپ نے غلط شخص کا انتخاب کیا ہے۔''
میں نے فوراً جواب دیا۔ پھر اپنا رخ نحور کی طرف کرتے ہوئے کہا:
''لیکن شائستہ کی بات بالکل درست ہے۔ ان کے میکے کے لوگ معمولی نہیں' اور ہو بھی کیسے سکتے ہیں۔ شائستہ اُمت محمدیہ میں سے ہیں۔ نبی عربی کی نسبت کے بعد ان کا میکہ معمولی نہیں رہا۔''(صفحات: ۶۲۔۶۳)

نوٹ کیجیے کہ شادی سے پہلے ہی یرمیاہ نبیؑ کے صحابی نحور اور شائستہ خیمے میں ایک ساتھ موجود ہیں۔ پھر شائستہ کس طرح شوخی کے ساتھ عبداللہ کے ساتھ ہنس کر گفتگو کر رہی ہے اور عبداللہ بھی جواب میں فقرہ چست کر رہا ہے۔ معاذ اللہ! کیا یہ ہے جنتی لوگوں کا طرزِ عمل؟

شائستہ نحور کے ساتھ صرف خیمہ ہی میں نہیں رہتی بلکہ دونوں شادی سے قبل میدانِ حشر میں گھومنے پھرنے میں بھی مشغول ہیں۔ عبداللہ بیان کرتا ہے:



''ہم حشر کے میدان کی سمت جا رہے تھے کہ راستے میں ایک جگہ نحور اور شائستہ نظر آئے۔ اُنہیں دیکھ کر میری حسِ مزاح بیدار ہو گئی۔ میں نے صالح سے کہا:
آؤ ذرا چلتے چلتے انہیں تنگ کرتے جائیں۔
ان دونوں کا رخ جھیل کی طرف تھا' اس لیے وہ ہمیں قریب آتے ہوئے دیکھ نہیں سکے۔ میں شائستہ کی سمت سے اس کے قریب پہنچا اور زور سے کہا:
''اے لڑکی! چلو ہمارے ساتھ۔ ہم تمہیں ایک نامحرم مرد کے ساتھ گھومنے پھرنے کے جرم میں گرفتار کرتے ہیں۔''
شائستہ میری بلند آواز اور سخت لہجے سے ایک دم گھبرا کر پلٹی۔ تاہم نحور پر میری بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے اطمینان کے ساتھ مجھے دیکھا اور کہا:
پھر تو مجھے بھی گرفتار کر لیجیے۔ میں بھی شریکِ جرم ہوں''۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیے۔ پھر ہنستے ہوئے کہا:
''مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہاں نہ جیل ہے اور نہ سزا دینے کی جگہ۔''
''جیل تو یہاں نہیں ہے' مگر سزا ضرور مل سکتی ہے۔ وہ یہ کہ مغویہ ہی کے ساتھ آپ کی شادی کرا دی جائے۔ ساری زندگی ایک ہی خاتون کے ساتھ رہنا وہ بھی جنت میں بڑی سزا ہے۔''
اس پر نحور نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔ شائستہ جو میرے ابتدائی حملے کے بعد سنبھل چکی تھی' ہنستے ہوئے بولی:
''ویسے تو آپ لوگ توحید کے بڑے قائل ہیں' مگر اس معاملے میں آپ لوگوں کی سوچ اتنی مشرکانہ کیوں ہو جاتی ہے؟''
نحور نے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی لاتے ہوئے کہا:
''آپ کو معلوم ہے عبداللہ! مشرکوں کا انجام جہنم ہوتا ہے۔ اس لیے آئندہ آپ شائستہ کے سامنے ایسی مشرکانہ گفتگو مت کیجیے گا' ورنہ آپ کی خیر نہیں۔''
صالح نے اس گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا:
''شائستہ! آپ اطمینان رکھیں' یہ عملاً موحد ہیں۔ ان کی ایک ہی بیگم ہیں۔''
اس پر نحور مسکراتے ہوئے بولے:
''یہ ان کا کارنامہ نہیں' ان کے زمانے میں یہ مجبوری تھی۔ خیر چھوڑیں اسے یہ بتائیے کہ آپ کی بیگم صاحبہ ہیں کہاں؟''
میں ابھی بھی سنجیدگی اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے ان کی طرف شرارت آمیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا:
''ہمیں بعض دوسرے بزرگوں کی طرح بیگمات کے ساتھ گھومنے کی فراغت میسر نہیں۔''

''لیکن دوسروں کی فراغت کو نظر لگانے کی فرصت ضرور میسر ہے''۔ نحور نے اسی لب و لہجے میں ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''ہم خوش ہونے والے لوگ ہیں' نظر لگانے والے ہرگز نہیں۔''

''مگر آپ نے مجھے تو نظر لگا دی ہے''۔ پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے بولے:

''میرے پیغمبر یرمیاہ نبی کو شہادت دینے کے لیے بلا لیا گیا ہے۔ میں چونکہ ان کا قریبی ساتھی تھا' اس لیے میرا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔''

یہ آخری بات کہتے ہوئے ان کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی تھی۔

''آپ جا رہے ہیں؟'' شائستہ نے پوچھا۔

''ہاں۔ تم اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ۔ میں کچھ دیر تک ان معاملات میں مصروف رہوں گا۔ عبداللہ نے مجھے نظر جو لگا دی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ ان فرشتوں کے ساتھ روانہ ہو گئے جو انہیں لینے آئے تھے۔''

(صفحات: ۱۹۴۔۱۹۶)

ملاحظہ فرمایئے کہ تحریر کے اس حصہ میں مصنف نے بڑے لطیف انداز میں عورتوں کے نامحرم مَردوں کے ساتھ میل ملاپ کی ممانعت کا کس طرح مذاق اُڑایا ہے۔ پھر شائستہ' نحور اور عبداللہ آپس میں نامحرم ہونے کے باوجود کس طرح بے تکلفی سے ہنسی مذاق کر رہے ہیں۔ اور تو اور فرشتہ صالح بھی اس مذاق میں برابر کا شریک ہے۔ مزید یہ کہ تعددِ ازواج کی سوچ کو ازراہِ مزاح مشرکانہ قرار دیا جا رہا ہے اور اِس سوچ کے حاملین کو مشرک قرار دے کر جہنم کی وعید سنائی جا رہی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تعددِ ازواج یعنی عدل کی شرط کے ساتھ ایک سے زائد خواتین کے ساتھ نکاح کی اجازت قرآنِ حکیم میں دی گئی ہے' ایک سے زائد خواتین سے نکاح کرنا نبی اکرم ﷺ کی سنت اور کئی صحابہ کرام ؓ کا عمل ہے' لیکن تحریر کے اِس حصہ میں عملاً موحد اُسے قرار دیا جا رہا ہے جس کی صرف ایک ہی بیوی ہے۔ گویا ایک سے زائد بیویاں رکھنے والے' معاذ اللہ' عملاً مشرک ہیں۔ اگرچہ یہ سب کچھ ازراہِ مزاح بیان کیا گیا ہے' لیکن یہ عبارات واضح طور پر ایک مخصوص ذہن سازی کی چغلی کھاتی ہیں۔

ناول میں تحریر ہے کہ عبداللہ کا بیٹا جمشید گنہگار تھا۔ اُس کے گناہوں کا سبب اُس کی بیوی کی آزاد خیالی تھی جس کی محبت میں جمشید بھی دنیاداری میں کھو گیا تھا۔ جمشید کی بیوی کو تو جہنم میں جانے کا فیصلہ سنا دیا گیا تھا' البتہ اللہ نے اپنی رحمتِ خاص سے جمشید کو معاف کر دیا اور وہ میدانِ حشر میں حوضِ کوثر کے پاس اپنے والدین سے آملا۔ جمشید کی والدہ ناعمہ کو اب فکر لاحق ہوئی کہ میں جمشید کے لیے دلہن تلاش کروں۔ وہ دلہن تلاش کرنے میدانِ حشر میں نکل کھڑی ہوئیں۔ اُس روز کیونکہ سب ہی کو جوان کر دیا گیا تھا' لہٰذا ایک جوان عورت میدانِ حشر میں ہونے والی بہو کی تلاش میں ماری ماری پھر



رہی ہے۔ اِس سلسلہ میں کیا پیش رفت ہوئی ملاحظہ فرمایئے۔ عبداللہ بیان کرتا ہے:

''میں اسی حال میں تھا کہ صالح نے میرے کان میں سرگوشی کی:

''ناعمہ بڑی شدت سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔''

''خیریت؟'' میں نے دریافت کیا۔

''بڑا دلچسپ معاملہ ہے۔ بہتر ہے تم چلے چلو۔''

یہ کہہ کر صالح نے میرا ہاتھ پکڑا اور تھوڑی ہی دیر میں ہم ناعمہ کے پاس کھڑے تھے۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ناعمہ کے ساتھ ایک بہت خوبصورت پری پیکر لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی یادداشت پر بہت زور ڈالا مگر میں اسے پہچان نہ سکا۔

ناعمہ نے خود ہی اس کا تعارف کرایا:

''یہ امورہ ہیں۔ ان کا تعلق حضرت نوح علیہ السلام کی امت سے ہے۔ یہ مجھے یہیں پر ملی ہیں۔ یہ آخری نبی یا ان کے کسی نمایاں امتی سے ملنے کی خواہشمند تھیں۔ نبی ﷺ تک تو میں انہیں نہیں لے جا سکتی تھی۔ البتہ میں نے سوچا کہ آپ سے انہیں ملوا دوں۔ آخر آپ بھی بڑے نمایاں لوگوں میں سے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ امورہ سے میرا تعارف کرانے لگی۔ اس تعارف میں زمین آسمان کے جو قلابے وہ ملا سکتی تھی' اس نے ملائے۔ میں نے بیچ میں مداخلت کر کے ناعمہ کو روکا اور کہا:

''ناعمہ میری بیوی ہیں۔ اس وجہ سے میرے بارے میں کچھ مبالغہ آمیز گفتگو کر رہی ہیں۔ البتہ ان کی یہ بات ٹھیک ہے کہ میں آپ کو اس امت کے نمایاں لوگوں بلکہ اپنے نبی سے بھی ملوا دوں گا۔''

ناعمہ کو میری بات کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ وہ جھنجھلا کر بولی:

''اگر میں مبالغہ کر رہی ہوں تو بتائیں یہ صالح آپ کے ساتھ کیوں رہتے ہیں اور یہ آپ کو کہاں کہاں لے کر جاتے ہیں؟''

میں نے جھگڑا ختم کرنے کے لیے کہا:

''اچھا چلو میں نے ہار مانی' لیکن پہلے امورہ سے تفصیلی تعارف تو ہو لینے دو۔''

امورہ ہنستے ہوئے بولی:

''انسان ہزاروں برس میں بھی نہیں بدلے بلکہ دوبارہ زندہ ہو کر بھی ویسے ہی ہیں۔ آپ دونوں ویسے ہی جھگڑا کر رہے ہیں جیسے میرے اماں ابا کرتے تھے۔''

''ان کے اماں ابا سے بھی میری ملاقات ہوئی ہے۔''

ناعمہ بیچ میں بولی' مگر یہ اس کا اگلا خوشی سے بھرپور جملہ تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ امورہ سے مل کر اتنا خوش کیوں ہے اور کیوں اس نے مجھے میدانِ حشر سے واپس بلوایا ہے۔

”امورہ کے شوہر نہیں ہیں۔“

میرے اندازے کی تصدیق صالح نے کردی۔ وہ میرے کان میں بولا:

”ناعمہ نے تمہاری ہونے والی بہو سے ملوانے کے لیے تمہیں بلایا ہے۔“

میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ ناعمہ جمشید کے لیے دلہن ڈھونڈ رہی تھی اور آخر کار اسے اس کوشش میں اس حد تک کامیابی ہو چکی تھی کہ لڑکی اسے پسند آ گئی تھی۔ مگر لڑکے لڑکی نے ایک دوسرے کو پسند کیا یا دیکھا بھی ہے یہ مجھے علم نہیں تھا۔ مگر ناعمہ کو اس سے کوئی زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ اس کے خیال میں اس کا راضی ہو جانا ہی اس رشتے کے لیے کافی تھا۔

میں نے دریافت کیا:

”امورہ‘ آپ کے شوہر کہاں ہیں؟“

امورہ نے شرما کر کہا:

”دنیا میں صرف ۱۵ سال کی عمر میں میرا انتقال ہو گیا تھا۔ میں بچپن سے ہی بہت بیمار رہتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اس کا یہ بدلہ دیا کہ بغیر کسی حساب کتاب کے شروع ہی میں میرے لیے جنت کا فیصلہ ہو گیا۔“

”اور باقی فیصلے تمہاری ہونے والی ساس کر رہی ہیں“۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

صالح کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ پھر امورہ بولی:

”مجھے آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ جنت میں بھی ہم ملتے رہا کریں گے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ میرے اماں ابا مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔“

ناعمہ بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے مڑی تو میں نے کہا:

”ٹھہرو مجھے تم سے کچھ کام ہے۔“

ناعمہ نے امورہ سے کہا:

”تم وہیں رکو جہاں ہم ملے تھے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

میں نے مذاق میں ناعمہ سے کہا:

”امورہ سے اس کا موبائل نمبر لے لو‘ اس رش میں کہاں ڈھونڈتی پھرو گی۔“

”یہ موبائل کیا ہوتا ہے؟“ امورہ نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

”یہ ایک ایسی بلا کا نام ہے جس کے بعد تم ناعمہ سے بچ نہیں سکتیں“۔ میں نے جواب دیا۔

صالح نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا:

”میرا خیال ہے کہ امورہ اپنی منزل تک پہنچ نہیں سکے گی‘ میں اسے پہنچا کر آتا ہوں۔“

(صفحات: ۲۰۴۔۲۰۷)

غور کیجیے کس طرح نامحرم لڑکی سے عبداللہ جیسا پارسا انسان میدانِ حشر میں نہ صرف محوِ گفتگو



ہے بلکہ دونوں باہم ہنسی مذاق بھی کر رہے ہیں۔ امورہ بھی اپنی شادی کے لیے کس طرح بے دھڑک اپنی ہونے والی ساس ناعمہ کے ساتھ عبداللہ کو انٹرویو دینے حاضر ہو گئی ہے۔ کیا نیک خواتین کا یہی کردار ہے؟ عبداللہ تو دنیا میں بھی نامحرم خواتین کو تبلیغ کرتا رہا ہے۔ اُس کی بیٹی لیلیٰ کی سہیلی عاصمہ احکاماتِ شریعت کی باغی تھی۔ عبداللہ میدانِ حشر میں عاصمہ کو دنیا میں کی جانے والی اپنی نصیحت یوں یاد دلاتا ہے:

”تمہیں یاد ہے عاصمہ! جب تم لیلیٰ کے ساتھ پہلی دفعہ میرے گھر آئی تھیں تو میں نے تم سے کیا کہا تھا۔“

”مجھے یاد ہے ابو‘ آپ نے اس سے کیا کہا تھا“۔ عاصمہ کی جگہ لیلیٰ نے جواب دیا۔

”آپ نے کہا تھا کہ بیٹا‘ تم میری بیٹی کی سہیلی ہو۔ دیکھو ایسی سہیلی بننا جو جنت میں بھی اس کے ساتھ رہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم دونوں خدا کو ناراض کر دو اور کسی بری جگہ تم دونوں کو ساتھ رہنا پڑے۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن تم دونوں ایک دوسرے کو الزام دو کہ تمہاری دوستی نے مجھے برباد کر دیا۔“ (صفحہ: ۹۴)

گویا عبداللہ دنیا میں بھی شرعی پردہ کا اہتمام نہیں کرتا تھا لیکن پھر بھی وہ اللہ کے مقربین میں شامل ہے۔ غور کیجیے کیا تصورات پھیلائے جا رہے ہیں! سورۃ الحشر کی آیات ۱۶ اور ۱۷ کی تفسیر میں امام قرطبیؒ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک حدیثِ مبارکہ نقل کی ہے جس میں بنی اسرائیل کے ایک ایسے زاہد شخص کی بربادی کی مثال بطورِ عبرت بیان کی گئی ہے جو ایک نامحرم عورت کو تبلیغ کرتے کرتے کئی جرائم کا ارتکاب کر بیٹھا تھا۔

**(۴) جہاد و قتال سے صرفِ نظر:** جاوید احمد غامدی دین کی نصرت میں اعلیٰ ترین کام دعوتِ دین کو سمجھتے ہیں اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی اہمیت سے باہتمام صرفِ نظر کرتے ہیں۔ اس ناول میں کہیں ایک جگہ بھی ذکر نہیں کہ جنت کے اونچے درجات اُن لوگوں کو ملنے ہیں جو قتال فی سبیل اللہ کی سعادت حاصل کرتے رہے۔ قرآنِ کریم تو اللہ کی راہ میں قتال کرنے والوں کو اللہ کا محبوب قرار دیتا ہے اور شہداء کو شہادت کے فوراً بعد جنت میں جانے کی بشارت دیتا ہے‘ لیکن ناول میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں۔ تاتاریوں کے ہاتھوں خلافتِ بنی عباس کے خاتمہ کا ذکر کرنے کے بعد صالح بیان کرتا ہے:

”اس سزا کے ساتھ جب کبھی وہ توبہ اور رجوع کرتے تو ان پر حکومت و انعامات کے دروازے کھل جاتے۔ اس کی ایک مثال وہ تھی جب تاتاریوں کے ہاتھوں مکمل تباہی کے بعد مسلمانوں نے ان تک اسلام کا پیغام پہنچایا تو تھوڑے ہی عرصے میں برباد شدہ مسلمان دوبارہ دنیا کی عظیم سپر پاور بن گئے۔“ (صفحہ: ۱۳۳)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان سلطنتِ عثمانیہ کی صورت میں سپر پاور صرف تبلیغِ اسلام کے

ذریعہ بنے تھے یا اُنہوں نے اِس کے لیے جہاد وقتال کا شرف بھی حاصل کیا تھا؟

ایک اور موقع پر صالح‘ عبداللہ کی بیوی ناعمہ کو بتاتا ہے کہ:

’’اب آخر میں سارے انبیاء اور شہداء پیش ہوں گے۔‘‘

’’کیا شہید وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے؟‘‘ ناعمہ نے صالح سے سوال کیا۔

’’نہیں یہ وہ شہداء نہیں۔ وہ بھی بڑے اعلیٰ اجر کے حقدار ہوئے ہیں۔ مگر یہ شہداء حق کی گواہی دینے والے لوگ ہیں۔ یعنی انہوں نے انسانیت پر اللہ کے دین کی گواہی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے انبیاء کے بعد ان کی دعوت کو آگے پہنچایا۔‘‘ (صفحہ: ۲۱۰)

ایک اور مقام پر صالح عبداللہ سے کہتا ہے:

’’چلو اب کوثر کے VVIP لاؤنج میں چلتے ہیں۔‘‘

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا‘ مگر مجھے اندازہ تھا کہ صالح کیا کہہ رہا ہے۔ تاہم اس نے اپنی بات کی وضاحت خود ہی کر دی:

’’آخرت کی کامیابی حاصل کرنے والوں کے دو درجات ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے دین کو فرائض وواجبات کے درجے میں اختیار کیا‘ بندوں اور خالق کے حقوق ادا کیے اور خدا کے ہر حکم کی پابندی کی۔ یہی لوگ جنت کی کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ وہ تھے جنہوں نے فرائض سے بڑھ کر قربانی کے مقام پر دین کو اختیار کیا۔ بدترین حالات اور مشکل ترین مواقع پر صبر واستقامت کا ثبوت دیا۔ نیکی اور خیر کے ہر کام میں سبقت اختیار کی۔ ہر حال میں حق کو اختیار کیا اور اس کے لیے ہر قیمت دی۔ خدا کے دین کی نصرت‘ اس کی نفل عبادت‘ اس کے بندوں پر خرچ اور ان کی خدمت کو اپنی زندگی بنالیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آج آخرت کے دن VIPs میں شامل کیے جائیں گے۔ ان کی نعمتیں‘ ان کے درجات‘ خدا سے ان کا قرب اور ان کا مقام ومرتبہ ہر چیز عام جنتیوں سے کہیں زیادہ ہے۔‘‘ (صفحات: ۱۳۴۔۱۳۵)

اِس مقام پر بھی اہلِ جنت کے بلند درجہ حاصل کرنے والوں میں جہاد وقتال کرنے والے سرفروشوں کے ذکر سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔

**(۵) سلف صالحین سے تعلق توڑنے کی ترغیب:** ایک موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عبداللہ کو بتاتے ہیں کہ تمہیں تمہارے زمانے کے تمام لوگوں میں بلند درجہ دینے کی وجہ کیا ہے:

’’دیکھو عبداللہ اس مجمع میں ہر شخص کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ جانتے ہو کہ اس کے نزدیک انتخاب کا معیار کیا ہے؟‘‘



میں خاموشی سے ان کی شکل دیکھنے لگا۔ انہوں نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا:

’’تعصّبات‘ جذبات اور خواہشات سے بلند ہو کر جس شخص نے حق کو اپنا مسئلہ بنالیا‘ اور توحید و آخرت کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا وہی اللہ کے نزدیک اس شہادت کے کام کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ دیکھو تمہارے زمانے کے مذہبی لوگ خواہشات سے تو شاید بلند ہو گئے تھے‘ مگر ان کی اکثریت تعصّبات اور جذبات سے بلند نہیں ہو سکی۔ لوگ مختلف فرقوں اور مسالک کے اسیر تھے۔ وہ صرف اسی بات کو قبول کرتے تھے جو ان کے حلقے کے لوگ کریں۔ وہ لوگوں کو اپنے ہی فرقے کی طرف بلاتے تھے۔ وہ اپنے اکابرین کی بڑائی کے احساس میں جیا کرتے تھے۔ جبکہ تم صرف خدا کی بڑائی کے احساس میں زندہ رہے۔ تم نے سچائی کو ہر قیمت دے کر قبول کیا اور ہر تعصّب سے پاک ہو کر اختیار کیا۔ خدا کی توحید تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ تھی اور خدا سے ملاقات پر لوگوں کو تیار کرنا تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مقصد۔ پھر تم نے دعوت کا کام صرف اپنی قوم ہی میں نہیں کیا بلکہ غیر مسلم اقوام تک قرآن کا پیغامِ توحید و آخرت پہنچانے کے لیے ایک طویل دعوتی جدّوجہد کی۔ یہی ساری باتیں آج تمہارے انتخاب کا سبب بن گئی ہیں۔‘‘ (صفحہ: ۱۵۱)

غور کیجیے کہ مسلک پرستی کی مذمت کی آڑ میں سلف صالحین سے تعلق اور ان کی پیروی کی بھی نفی کر کے براہ راست خدا پرستی کی ترغیب دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا پرستی ہوتی ہی سلف صالحین کی پیروی سے ہے۔ ارشادات باری تعالیٰ ہیں:

﴿ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۵﴾ (الفاتحة)

’’ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔ اُن لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا ہے۔‘‘

﴿ وَاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ﴾ (لقمٰن: ۱۵)

’’اور پیروی کرو اُس کے راستے کی جو کہ رجوع ہوا میری طرف۔‘‘

﴿ وَاتَّبَعۡتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ ؕ﴾ (یوسف: ۳۸)

’’اور (یوسف ؑ فرماتے ہیں) میں نے پیروی کی اپنے آباء واَجداد ابراہیم ؑ اور اسحاق ؑ اور یعقوب ؑ کے راستے کی۔‘‘

**(۶) غیر سنجیدہ حرکات کی حوصلہ افزائی:** میدانِ حشر میں مصنّف کے نزدیک عام نیک لوگوں کو جنت میں جانے کا پروانہ پہلے ہی دے دیا جائے گا اور مقرّبین کو بعد میں۔ مقرّبین کو جب بغیر حساب جنت میں داخلہ کی بشارت دی جائے گی تو دیگر اہلِ جنت خوشی سے بے قابو ہو کر غیر سنجیدہ حرکات کریں گے۔ عبداللہ بیان کرتا ہے کہ:

’’جس وقت کوئی شخص پیش ہوتا‘ اس کے زمانے کے سارے حالات‘ اس کے مخاطبین کی تفصیلات‘ لوگوں کا ردِعمل اور اس کی جدّوجہد ہر چیز کو تفصیل سے بیان کیا جاتا۔ سامعین یہ سب سنتے اور اسے داد دیتے۔ آخر میں جب اس کی کامیابی اور سرفرازی کا اعلان ہوتا تو مرحبا اور ماشاء اللہ کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی۔ بعض اہلِ جنت تالیاں بجاتے‘ بعض اٹھ کر رقص کرنے لگتے اور بعض سیٹیاں اور چیخیں مار کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔‘‘ (صفحہ:۲۱۴)

قرآنِ مجید تو بیان کرتا ہے کہ جنت والے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کر رہے ہوں گے‘ لیکن مصنف کے نزدیک خوشی کے موقع پر اہلِ جنت کا طرزِ عمل انتہائی غیر سنجیدہ ہوگا۔ گویا اس دنیا میں بھی اگر خوشی کے موقع پر چھچھوری حرکات کی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وقار کے منافی حرکات کر کے بھی جنت حاصل کی جاسکتی ہے۔

**(۷) دھوم دھام سے شادی کی ترغیب:** جب عبداللہ اور اس کی بیوی ناعمہ جنّت میں پہنچ جائیں گے تو اُن کے بچے جمشید‘ انور‘ لیلیٰ‘ عالیہ اور عارفہ جنت میں اُن کی دوبارہ شادی کریں گے‘ لیکن پوری تیاری اور دھوم دھام سے۔ عبداللہ بیان کرتا ہے کہ ناعمہ اپنے بچوں سے کہتی ہے کہ:

’’یہ کیا بچپنے والی بات تم لوگ کر رہے ہو کہ ہماری دوبارہ شادی ہوگی؟‘‘

عالیہ نے کہا:

’’امی پچھلی دنیا میں ہم میں سے کوئی بھی آپ کی شادی میں موجود نہیں تھا۔ اس لیے ہم سب بہن بھائیوں کی متفقہ رائے ہے کہ ہم آپ لوگوں کی شادی بڑے دھوم دھام سے کریں گے۔ ہم آپ کو خود دلہن بنا کر رخصت کریں گے اور اس وقت تک آپ کا ابو سے پردہ ہوگا۔‘‘

انور نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

’’پردے والی بات تو بڑی سخت ہے۔ بس اتنی شرط لگا دو کہ تنہائی میں نہیں ملیں گے۔‘‘

’’اس مہربانی کا بہت شکریہ۔ یہ بتادو کہ شادی کب ہوگی؟‘‘ میں نے بے بسی سے پوچھا۔

’’جب تیاریاں ہو جائیں گی‘‘۔ عارفہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

’’اور کیا تیاریاں ہوں گی؟‘‘ میں نے دریافت کیا۔

’’میں بتاتی ہوں‘‘ لیلیٰ بولی۔

’’جگہ تو یہی ٹھیک ہے۔ بس کپڑے‘ زیورات وغیرہ کا انتظام کرنا ہے۔‘‘

’’اور مجھے بھی اپنے ذرا اچھے کپڑے بنوانے ہیں‘ ابو جیسے۔ مجھے تو ابو کے کپڑے دیکھنے کے بعد اپنے کپڑے اچھے ہی نہیں لگ رہے‘‘۔ جمشید نے بھی مطالبات میں اپنا حصہ ڈالا۔

’’اچھا یہ سب تیاریاں ہوگئیں تو شادی ہو جائے گی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’کیوں نہیں؟‘‘ سب نے مل کر کہا۔



’’چلو پھر ابھی ہی چلو۔ میں تمہیں جنت کے سب سے بڑے شاپنگ کے علاقے میں لے چلتا ہوں۔ ویسے تو تم لوگ وہاں گھس بھی نہیں سکتے‘ لیکن میری طرف سے جو دل چاہے آج شاپنگ کرلو۔‘‘

اس پر سارے بچوں نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا۔ پھر ہم شاپنگ کے لیے روانہ ہوگئے۔‘‘

(صفحات:۲۵۳۔۲۵۴)

جب جنت میں دھوم دھام سے شادی ہوگی تو پھر دنیا میں بھی ایسا اسراف کرنے میں کیا حرج ہے۔ پھر دیکھا آپ نے جنت میں بھی دنیا کی طرز کے شاپنگ سینٹر موجود ہیں۔

**(۸) موسیقی جائز ہے؟:** صاحبِ کتاب کا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب قرآن وسنت سے حاصل شدہ رہنمائی کی بنیاد پر لکھی گئی ہے‘ لیکن حقیقت اِس کے برعکس ہے اور مصنف کا دعویٰ خلافِ واقعہ ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ جنت میں کھانا کھانے کا نقشہ عبداللہ کس طرح کھینچ رہا ہے:

’’تاروں کی دودھیا روشنی اور ٹھنڈی ہوا میں کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے فضا کو بے حد مؤثر بنا رکھا تھا۔ بازار کی طرح یہاں بھی پس منظر میں دھیمی سی موسیقی چل رہی تھی۔ کھانے کی اتنی ورائٹی تھی کہ کسی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کھائیں۔ جو چیز لیتے وہ اتنی لذیذ ہوتی کہ چھوڑنے کا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ مگر شکر خدا کا کہ یہاں پیٹ بھرنے کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا‘ جس کی بنا پر جب تک دل چاہتا رہا ہم لوگ بیٹھ کر کھاتے رہے۔‘‘ (صفحہ:۲۵۵)

اِس کے بعد عبداللہ جنت کے بازار کا نقشہ یوں بیان کرتا ہے:

’’وسیع وعریض رقبے پر پھیلا ہوا یہ بازار اپنے اندر ہر قسم کی دکانیں لیے ہوئے تھا۔ ملبوسات‘ فیشن‘ جوتے‘ آرائش‘ تحائف اور نجانے کتنی ہی دیگر چیزوں کی دکانیں یہاں تھیں۔ ہر دکان اتنی بڑی تھی کہ کئی گھنٹوں میں بھی نہیں دیکھی جاسکتی تھی۔ دنیا کا بڑے سے بڑا شاپنگ سنٹر بھی ان دکانوں کے سامنے کچھ نہ تھا۔ لیکن یہاں کی اصل کشش یہ دکانیں نہیں بلکہ وہ مسحور کن ماحول تھا جو ہر سو چھایا ہوا تھا۔ دل ودماغ کو اپنی طرف کھینچتی چیزوں سے بھری دکانیں‘ ان میں جگمگ جگمگ کرتی روشنیاں‘ معطّر فضا‘ خنک ہوا‘ دھیمی دھیمی موسیقی‘ خوبصورت فوارے‘ رنگ ونور کی ہزارہا صناعیاں‘ طرح طرح کے دیگر ڈیزائنز‘ دلکش مناظر اور حسین ترین لوگوں کی چہل پہل‘ سب مل کر ایک انتہائی متاثر کن ماحول پیدا کر رہے تھے۔ یہاں کا ماحول آنے والوں کی دیکھنے‘ سننے‘ سونگھنے اور دوسری ہر اُس قوت پر جس سے اس کا ذہن کوئی تاثر قبول کرتا ہے‘ اس طرح حملہ کر رہا تھا کہ اسے گنگ کر دیتا۔ دوسروں کے لیے یہ جگہ خریداری کی جگہ تھی جب کہ میرے لیے یہ ذوقِ جمال کی تسکین کا ایک اعلیٰ ذریعہ تھی۔ مگر اُس وقت ناعمہ کے قرب نے یہاں کے ہر رنگ کو میری نظر میں پھیکا کر دیا تھا۔‘‘ (صفحہ:۲۵۶)

نوٹ فرمائیے' بازار میں دلکش مناظر اور حسین ترین لوگوں کی چہل پہل سے مصنف کس قسم کی معاشرت کے لیے جواز پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

**(۹) مخلوط محافل کی اجازت:** عبداللہ جنت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنتیوں کے لیے ایک دعوت کا ذکر کرتا ہے۔ اِس دعوت کے میزبان ہیں حضرت نوحؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ' حضرت عیسیٰؑ اور نبی اکرم ﷺ۔ اللہ تعالیٰ اور انبیاءؑ کی طرف فرضی باتیں منسوب کرنا ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ اب ذرا اِس دعوت میں برپا ہونے والی محفل کا رنگ ملاحظہ فرمائیے:

''زرق برق لباس پہنے حسین وجمیل نوجوان مرد اور عورتیں ہر سمت نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے روشن' آنکھیں چمک دار' لبوں پر قہقہے اور مسکراہٹیں تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے دنیا کی محفلیں یاد آ گئیں جہاں خواتین میک اپ کا تام جھام کیے' خدا کی حدود کو پامال کرتی اور اپنی زینت اور نسوانیت کی نمائش کرتی محفلوں میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ مرد اپنی نگاہوں کو جھکانے کے بجائے اس نمائش سے اپنا حصہ وصول کرتے تھے۔ اپنی نمائش سے رکنے والی خواتین اور اپنی نگاہوں کو پھیرنے والے مَردوں کو کتنی مشقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

مگر اب ساری مشقت ختم۔ میں نے دل میں سوچا یہ محفل حسین ترین خواتین سے بھری ہوئی تھی جن کے لباس اور زیورات اپنی خوبصورتی میں بے مثل اور ہر نظر کو خیرہ کرنے کے لیے بہت تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے قلوب اس طرح پاکیزہ کر دیے تھے کہ نگاہوں میں آلودگی اور دلوں میں خیانت کا تصور بھی نہیں رہا تھا۔ ہر مرد اور ہر عورت خوبصورتی مگر پاکیزگی کے احساس میں زندہ تھا۔ اب اپنی زینت کے اخفا کا کوئی حکم تھا اور نہ نگاہوں کو پھیرنے کی کوئی پابندی تھی۔ کتنی تھوڑی تھی وہ مشقت اور کتنا زیادہ ہے یہ بدلہ۔'' (صفحہ:۲۵۸)

قرآنِ حکیم جنت کی خواتین کا نقشہ اِس طرح کھینچتا ہے:

﴿ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿٥٢﴾ ﴾ (صٓ)

''اور اُن کے پاس ہوں گی نیچی نگاہوں والی عورتیں جو اُن کی ہم عمر ہوں گی۔''

﴿ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿٤٨﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿٤٩﴾ ﴾ (الصّٰفّٰت)

''اور ان کے پاس عورتیں ہوں گی نیچی نگاہوں والی۔ وہ اس طرح ہوں گی جیسے چھپائے جانے والے انڈے۔''

﴿ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴿٢٢﴾ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿٢٣﴾ ﴾ (الواقعۃ)

''اور ان کے لیے بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی۔ وہ چھپائے ہوئے موتیوں کی مانند ہوں گی۔''



﴿ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿٧٢﴾ ﴾ (الرحمٰن)

''حوریں ہیں جو خیموں میں رکی ہوئی ہیں۔''

غور فرمائیے! مصنف صاحب نے اِن آیات کے برعکس جنتی خواتین کا کیا شوخ طرزِ عمل پیش کیا ہے۔

**(۱۰) نامحرم کو دوسری بار دیکھنے کا جواز:** میدانِ حشر اور جنت میں عبداللہ نے جو کچھ دیکھا وہ خواب تھا۔ عبداللہ نے یہ خواب حرم میں سوتے ہوئے دیکھا تھا۔ بیدار ہونے کے بعد اُس نے ایک بزرگ کی رہنمائی کی اور اُنہیں ان کی بیٹی اور نواسی تک پہنچایا۔ نواسی کو دیکھا تو وہ بالکل ناعمہ کی طرح تھی جو خواب میں عبداللہ کی بیوی تھی۔ اس خاتون پر پہلی نظر پڑی تو عبداللہ نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے بعد نانا نے تعارف کراتے ہوئے کہا:

''میرا نام اسماعیل ہے۔ یہ میری بیٹی آمنہ ہے۔''

وہ ایک لمحہ کے لیے رکے اور اپنی نواسی کی طرف دیکھتے ہوئے محبت آمیز لہجہ میں بولے:

''اور یہ سب سے زیادہ تھکی ہوئی میری نواسی ہے۔ اس کا نام ناعمہ ہے۔''

عبداللہ کی شدید ترین خواہش تھی کہ ایک اجنبی نام اس کے کانوں تک پہنچے تاکہ وہ کچھ تو خود کو بہلاوا دے سکے' مگر ناعمہ کا نام تابوت کی آخری کیل بن کر اس کے کانوں میں گونجا۔ اس دفعہ دنیا کی کوئی طاقت عبداللہ کو دوبارہ نظر اٹھانے سے نہیں روک سکی۔ اس کے سامنے واقعی ناعمہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی جسے اس نے زندگی میں پہلی دفعہ جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مگر جسے وہ رات خواب میں.................

عبداللہ نے گھومتے ہوئے دماغ سے سوچا:

''اگر وہ خواب تھا تو یہ کیسی حقیقت تھی۔ یہ اگر حقیقت ہے تو پھر وہ خواب..........''

معاملہ عبداللہ کی برداشت سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اسے آنے والے چکر اب تیز ہو گئے۔ وہ ناعمہ کو دیکھتے ہوئے لہرایا اور بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔'' (صفحہ:۲۷۱)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خوابوں کی دنیا سے باہر آنے کے بعد اب ایک نامحرم خاتون کو دیکھنا' پہلی نظر کے بعد دوسری بار بدنظری کرنا اور دیکھ کر تڑپتے ہوئے بیہوش ہو جانے کا بیان آخر کس مقصد کے لیے ہے؟ اِس صورتِ حال کے بیان سے کون سا پاکیزہ مقصد ہے جو مصنف حاصل کرنا چاہتا ہے' سوائے اس کے کہ عام ڈراموں اور فلموں کی طرح قارئین کے جنسی جذبات کو مشتعل کرنا اور کہانی کا سنسنی خیز اختتام کرنا۔

**(۱۱) تفسیری موشگافیاں:**

i) صالح سے گفتگو کرتے ہوئے عبداللہ کہتا ہے:

''تم نے جو کچھ کہا ہے قرآن کریم کے بیانات سے مجھے اس کا پہلے ہی اندازہ تھا۔ قرآن

کریم کے بیانات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ زمین کے وارث خدا کے نیک بندے ہوں گے اور سطحِ زمین جنت میں بدل دی جائے گی جہاں اہل جنت کا ٹھکانہ ہوگا۔ زمین کے بیچ میں اہل جہنم ہوں گے' جبکہ آسمانوں میں موجود ستارے اور کہکشائیں بطور انعام و بادشاہی اہل جنت میں تقسیم ہوں گے۔'' (صفحہ:۱۰۵)

مصنف نے یہاں تفسیری اعتبار سے دو موشگافیاں کی ہیں۔ پہلی یہ کہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جنت اور جہنم دونوں زمین پر ہوں گی۔ مزید یہ کہ جنت اور جہنم موجود نہیں بلکہ انہیں وجود میں لایا جائے گا۔

جنت کے حوالے سے سورۃ النجم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی ﴿۱۵﴾﴾

''اور وہ تو ان کو دیکھ چکے ہیں ایک اور بار بھی۔ اس انتہائی بیری کے پاس۔ اسی کے پاس ہے وہ رہنے والی جنت۔''

مفتی محمد شفیع صاحبؒ اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں مذکورہ بالا آیت ۱۵ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس آیت نے یہ بھی بتلا دیا کہ جنت اُس وقت بھی موجود تھی' جیسا کہ جمہور امت کا عقیدہ یہی ہے کہ جنت و دوزخ قیامت کے بعد پیدا نہیں کی جائیں گی' یہ دونوں مقام اس وقت بھی موجود ہیں۔ اس آیت نے جنت کا محل وقوع بھی بتلا دیا کہ وہ ساتویں آسمان کے اوپر' عرش رحمٰن کے نیچے ہے۔ گویا ساتواں آسمان جنت کی زمین اور عرش رحمٰن اس کی چھت ہے۔ دوزخ کا محل وقوع کسی آیت قرآنی یا روایت حدیث میں صراحتاً نہیں بتلایا۔''

جنت کے آسمان کے اوپر ہونے کی دلیل یہ آیت بھی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۴۰﴾﴾ (الاعراف)

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا' اُن کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور وہ لوگ کبھی جنت میں نہ جائیں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ کے اندر سے نہ چلا جائے۔ اور ہم مجرموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔''

(ii) صالح' عبداللہ کو عہدِ الست کے حوالے سے بتاتا ہے کہ:

''ہاں مگر اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے سامنے یہ موقع رکھا تھا کہ وہ جنت میں اللہ تعالیٰ کی ابدی رفاقت کا شرف حاصل کر لیں۔ لیکن اس کے لیے انہیں دنیا میں کچھ وقت ایسے گزارنا ہوگا کہ خدا ان کے سامنے نہیں ہوگا۔ صرف اس کے احکام ان کے سامنے آئیں



گے اور انہیں بِن دیکھے رب کی عبادت اور اطاعت کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ زمین کی بادشاہی عارضی طور پر امانتاً اس مخلوق کو دے دی جائے گی اور اپنی بادشاہی کے زمانے میں اس مخلوق کو اپنے بارے میں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ صاحب اختیار بادشاہ ہونے کے باوجود بِن دیکھے خدا کی اطاعت کے لیے تیار ہے۔ جس کسی نے اقتدار اور اختیار کی اس امانت کا درست استعمال کیا اس کا بدلہ جنت میں خدا کی ابدی رفاقت ہوگی اور ناکامی کی صورت میں جہنم کا عذاب۔''

''تو پھر کیا ہوا؟''

''یہ ہوا کہ ساری مخلوقات ڈر کے پیچھے ہٹ گئیں۔ اس لیے کہ جنت جتنی حسین ہے' جہنم اتنی ہی بھیانک جگہ ہے۔ حشر کی سختی کو تو ابھی تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کے بعد کون عقل منداس امتحان میں کودنے کی کوشش کرتا۔''

''اور غالباً ہم جذباتی انسان اس امتحان میں کود پڑے''۔ میں نے لقمہ دیا۔

''ہاں یہی ہوا تھا' لیکن خدائی امانت اٹھانے کا یہ عزم روحِ انسانی نے اجتماعی طور پر کیا تھا۔ اس لیے خدا کے عدل کا تقاضا یہ تھا کہ ہر ہر انسان کو پیدا کر کے براہِ راست اس سے یہ معلوم کیا جائے کہ وہ کس حد تک اس امتحان میں اترنے کے لیے تیار ہے۔

عبداللہ! یہ اس لیے ہوا کہ تمہارا رب کسی پر رائی کے دانے کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ سو اُس نے سب انسانوں کو پیدا کیا۔ سب کے سامنے اپنے پورے منصوبے کو رکھا۔ ظاہر ہے انسانوں کی اکثریت پہلے ہی اس مقصد کے لیے تیار تھی۔ اسی لیے وہ پورے شعور کے ساتھ اس امتحان میں کودنے کے لیے تیار ہو گئے۔ البتہ جن لوگوں نے یہ خطرہ مول لینے سے انکار کر دیا' ان سب کے بارے میں یہ فیصلہ ہوا کہ انہیں سن بلوغت تک پہنچنے سے قبل ہی مر جانے والے بچوں اور بچیوں کا کردار سونپ دیا جائے۔ یہی بچیاں اور بچے جنت کی بستی میں حور و غلمان بنا دیے جائیں گے۔'' (صفحات:۷۹۔۸۰)

مصنف نے عہدِ الست کے حوالے سے تفسیر کرتے ہوئے جو تحریر کیا ہے کہ اللہ نے ہر ہر انسان سے علیحدہ علیحدہ دریافت کیا' کیا وہ اللہ کا عہد قبول کرنے کو تیار ہے؟ اب انسان کے پاس اختیار تھا کہ قبول کرے یا نہ کرے۔ یہ مصنف کی خود ساختہ رائے ہے' جسے قرآن' حدیث یا اسلاف کی آراء میں سے کسی کی بھی سند حاصل نہیں ہے۔

(iii) مصنف کے نزدیک نبوت وہبی نہیں بلکہ کسبی شے ہے۔ جن انسانوں نے اپنے اختیار سے امتحان کا سخت پرچہ چُنا' اُنہیں اللہ نے نبی بنا دیا۔ یہ ایک ایسا گمراہ کن نظریہ ہے جو اجماعِ امت کے خلاف ہے۔ عبداللہ کے ایک سوال کے جواب میں صالح کہتا ہے:

''ہاں' مگر اس میں بھی خدا کی کریم ہستی نے کمال عنایت کا مظاہرہ کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ دنیا میں سب کا امتحان یکساں نہیں ہوتا۔ یہ امتحان بھی اُس روز ہر شخص نے اپنی مرضی سے چُن لیا

تھا۔ جو بہت زیادہ حوصلہ مند لوگ تھے انہوں نے نبیوں کا زمانہ چن لیا۔ ان لوگوں کا امتحان یہ تھا کہ ہر سو پھیلی گمراہی کے دور میں انبیاء کی تصدیق کر کے ان کا ساتھ دیں۔ ان کی کامیابی کے لیے اصل شرط یہ تھی کہ بدترین مخالفت میں بھی ثابت قدم رہیں‘ اس راہ میں ہر مشکل کو برداشت کریں اور انبیاء کا پیغام آگے پہنچائیں۔ اس لیے ان کا اجر بھی بڑا رکھا گیا‘ مگر انہیں انبیاء کی براہ راست رہنمائی کی سہولت کی بنا پر کفر و انکار کی صورت میں عذاب بھی انتاہی شدید ہوتا۔ انہی لوگوں میں ایک طرف حضرت ابوبکرؓ جیسے لوگ تھے اور دوسری طرف ابولہب جیسے دشمنانِ حق۔

آزمائش کی دوسری سطح وہ تھی جس میں لوگوں نے امت مسلمہ اور نبیوں کے بعد ان کی امت میں شامل ہونے کا پرچہ امتحان چنا۔ ان لوگوں کا امتحان یہ تھا کہ بعد کے زمانے میں پیدا ہونے والی گمراہیوں‘ فرقہ واریت‘ بدعت اور غفلت سے بچ کر شریعت کے تقاضوں کو ہر حال میں نبھاتے رہیں اور معاشرے کے خیر وشر سے لاتعلق ہونے کے بجائے لوگوں میں نیکی کو پھیلائیں اور انہیں برائی سے روکیں۔ یہ ذمہ داریاں ان پر اس لیے عائد کی گئیں کہ ان کے پاس انبیاء کی تعلیمات تھیں اور وہ پیدائشی مسلمان تھے جنھیں قبولِ اسلام کے لیے کسی کڑی آزمائش سے نہیں گزرنا پڑا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عام انسانوں کے مقابلے میں ان کی رہنمائی زیادہ کی گئی‘ انھیں زیادہ اجر کمانے کے مواقع دیے گئے‘ لیکن غفلت کی صورت میں ان کا حساب کتاب انتاہی سخت ہونا طے پایا۔‘‘

’’میرا اور دیگر مسلمانوں کا تعلق اسی گروہ سے تھا نا؟‘‘

’’ہاں تم ٹھیک سمجھے۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جنھوں نے اپنا پرچۂ امتحان بہت سادہ رکھا۔ یہ سارے لوگ نبیوں کی براہ راست رہنمائی کے بغیر پیدا کیے گئے اور ان کا پرچۂ امتحان فطرت میں موجود ربانی ہدایت تھی۔ یعنی توحید اور اخلاق کا امتحان۔ انہیں عام مسلمانوں کی طرح نہ شریعت کے امتحان میں ڈالا گیا نہ نبیوں کی رفاقت کے کڑے امتحان میں۔ ظاہر ہے کہ ان کا حساب کتاب سب سے ہلکا ہوگا‘ ان کے لیے شدید عذاب کا اندیشہ بھی کم ہے اور اجر کے مواقع بھی اسی تناسب سے کم ہیں۔‘‘

’’اور انبیاء کا معاملہ کیا تھا؟‘‘

’’انہوں نے امتحان کا سب سے سخت پرچہ چنا۔ اس لیے ان کی رہنمائی براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی گئی اور اسی لیے ان کے احتساب کا معیار بھی سب سے زیادہ سخت تھا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ صرف ایک اجتہاد تھا۔ لیکن دیکھو ان کو کس طرح اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے پیٹ میں بند کر دیا۔‘‘

پھر اس نے اس طویل گفتگو کا خلاصہ کرتے ہوئے کہا:



’’اصل اصول جو تمام اقسام کے گروہوں میں کام کر رہا ہے وہ ایک ہی ہے۔ زیادہ رہنمائی‘ زیادہ سخت حساب کتاب اور زیادہ بڑی سزا جزا۔ کم رہنمائی‘ ہلکا حساب کتاب‘ کم سزا جزا۔ مگر کسی انسان کا تعلق کس گروہ سے ہے اس کا انتخاب انسانوں نے خود کیا ہے‘ اللہ تعالیٰ نے نہیں۔‘‘ (صفحات: ۸۰۔۸۱)

## دردمندانہ گزارش

اِس تحریر کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف نے روزِ قیامت ظہور میں آنے والے ہولناک اور دلکش مناظر کی دلچسپ نقشہ کشی کرتے ہوئے کس طرح گمراہ کن تصورات ذہنوں میں ڈالنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ بہت سے سادہ لوح حضرات وخواتین نے مصنف کی چالاکی کو سمجھے بغیر اس کتاب کو بڑے پیمانے پر پھیلایا ہے۔ اُنہیں چاہیے کہ:

۱) اپنی اِس تقصیر پر گڑگڑا کر اللہ کی بارگاہ میں توبہ کریں اور معافی مانگیں۔

۲) جن لوگوں تک یہ کتاب پہنچائی ہے اُنہیں اس کتاب میں موجود گمراہیوں سے آگاہ کریں۔

۳) آئندہ کے لیے عہد کریں کہ وہ کسی گمنام یا غیر معتبر مصنف کی کتاب نہیں پڑھیں گے جب تک کسی معتبر ذریعہ سے مصنف اور کتاب کے مضامین کی درستگی کی تصدیق نہ کر لیں۔

---

### بقیہ: نماز باجماعت کی اہمیت

(بدبخت) قیامت میں قارون‘ فرعون‘ ہامان اور (مشرکینِ مکہ کے سردار) اُبی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔ (مسند احمد‘ مسند دارمی‘ شعب الایمان للبیہقی)

جب کافر اور مسلمان کے درمیان نماز کا فرق ہے‘ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’بندہ کے اور کفر کے درمیان نماز چھوڑ دینے ہی کا فاصلہ ہے‘‘ (صحیح مسلم) تو بے نمازی آخرت کے لیے کس سہارے پر مطمئن ہیں؟ اسی طرح جو لوگ پنجگانہ نماز ادا کرتے ہیں‘ مگر ہر نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے مسجد میں جانے کو ضروری نہیں سمجھتے‘ انہیں بھی اپنا طرزِ عمل ضرور بدلنا چاہیے‘ کیونکہ نماز باجماعت کا رہ جانا عظیم خسارہ اور چھوڑنا سنگین غلطی ہے۔ اور خسارے والا کام چھوڑ کر فضیلت والے کام کی طرف لپکنا چاہیے۔ کچھ پتا نہیں زندگی کا سفر کب ختم ہو جائے اور سوال وجواب شروع ہو جائیں۔

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی کی کتاب ’’نماز باجماعت کی اہمیت‘‘ سے مدد لی گئی ہے‘ جو اس موضوع پر نہایت مفید اور جامع کتاب ہے۔ یہ کتاب دار النور‘ اسلام آباد نے شائع کی ہے اور مکتبہ قدوسیہ‘ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

# والدین کے فرائض‘ اولاد کے حقوق

(گزشتہ سے پیوستہ)

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

## انسانی زندگی کے پانچ ادوار اور اولاد کی تربیت

اولاد کی نفسیات کے حوالے سے ان کی عمر‘ ذہن‘ صلاحیتوں اور دلچسپیوں کے بارے میں صحیح اور درست آ گاہی اور نشاندہی بے حد ضروری ہے۔ ہم اولاد کے بارے میں رہنمائی اور ہدایت اسی رب سے لے سکتے ہیں جس نے ہمیں اور انہیں پیدا کیا ہے۔ سورۃ الحدید میں خالق کائنات نے انسان کی زندگی کے پانچ ادوار کا ذکر کیا ہے اور وہ اس خوبصورت‘ جامع اور مکمل انداز سے بیان کیے گئے ہیں کہ واقعتاً پوری ساٹھ‘ ستّر سالہ زندگی کے مختلف عنوانات ایک آیت میں سمو دیے گئے ہیں‘ جن کے ذریعے نہ صرف ہم اپنی اولاد کی بلکہ خود اپنی بھی تربیت بہترین انداز میں کر سکتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَہۡوٌ وَّ زِیۡنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَ تَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیۡثٍ اَعۡجَبَ الۡکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَکُوۡنُ حُطٰمًا ؕ وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۙ وَّ مَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضۡوَانٌ ؕ وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ ﴿۲۰﴾﴾ (الحدید)

’’خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات نے کاشت کاروں کو خوش کر دیا‘ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی‘ پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے۔ اور (اس کے برعکس) آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی



خوشنودی ہے۔ اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔‘‘

والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ الحدید کی جہاں بہت عمدہ تفسیر بیان کی ہے وہاں انہوں نے زندگی کے ان ادوار کو بہت اہمیت دی ہے اور ان ادوار کو مندرجہ بالا آیت کی روشنی میں تفصیلاً بیان کیا ہے۔ میں نے ان سے بھی رہنمائی لی ہے اور کچھ اپنے ناقص تجربے کی بنیاد پر بھی جو اس حوالے سے حاصل کیا ہے‘ ذیل میں بیان کر دیا ہے تاکہ اولاد کے حقوق کی ادائیگی اور نشوونما بہترین انداز سے کی جا سکے۔

**پہلا دورِ زندگی: لَعِبٌ:** انسانی زندگی کے پانچ ادوار میں سے لَعِب سب سے پہلی سٹیج ہے۔ دنیا کو بھی اللہ تعالیٰ نے جا بجا لعب اور لھو کہا ہے‘ جس سے مراد یہ ہے کہ اگر بے مقصد زندگی گزاری جائے تو وہ ایک چھوٹے بچے کے بے کار اور بے مقصد کھیل کود کی طرح ہے۔ دنیا میں وہ وقت تو بہرصورت گزارنا ہی ہے جو ہماری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے‘ اگر ہم اس کو لعب کے طور پر گزارتے ہیں تو ہمارے میں اور ایک بچے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ بچپن کے مشاغل میں کھیل کود‘ بلاوجہ کی مصروفیت اور بے کار شغل جس میں کوئی بھی مقصد نہ ہو‘ جیسے اچھلنا کودنا‘ کھلونوں سے شوق پورا کرنا‘ آپس میں مل کر یا تو کھیل کے ذریعے مصروف رہنا یا ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا کرکے‘ شامل ہیں۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جس میں لڑائی جھگڑا ہو یا دوستی‘ پل کا بھروسہ نہیں ہوتا اور نہ ہی دوستیاں اور دشمنیاں دیرپا ہوتی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس عمر میں کوئی مقصد ہوتا ہی نہیں ہے‘ بلکہ وقت گزارنے کے لیے شور شرابا‘ ہاتھا پائی اور کھیل کود میں مگن ہونا ضروری ہوتا ہے۔ عام طور پر اس عمر میں جو بھی افعال و اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ہوتے ہیں‘ لیکن دوسری طرف یہی وہ عمر ہے جس میں بچوں کی ذہنی تعمیر ہو رہی ہوتی ہے۔ والدین کے لیے اس کو صحیح استعمال کرنا بہت ضروری ہے۔ پھر اللہ رب العزت نے اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ بچے سلیم الفطرت ہوتے ہیں۔ کھیل کود بچوں کو برا یا گنہگار نہیں بناتے بلکہ والدین کا خود اپنا طرزِ عمل ہی ایسا ہوتا ہے جو بچوں کو برائی کی طرف مائل کرتا ہے۔ بچپن میں وہ بدتمیزی‘ بداخلاقی‘ جھوٹ‘ گالم گلوچ‘ دھوکہ بازی‘ مبالغہ آرائی وغیرہ گھر سے سیکھتے ہیں۔ پھر والدین کی دلچسپی اولاد سے زیادہ ٹی وی‘ کیبل‘ موبائل اور ٹیلیفون پر دوسروں سے ہنسی مذاق کرنے میں ہو تو بچے اس بات سے محروم رہ جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ پیار محبت سے گفتگو کی جائے اور ان کو وقت دیا جائے۔ اگر والدہ خود گھر سے باہر کسی ملازمت یا سیکھنے سکھانے میں مصروف ہو جاتی ہو تو اولاد گھر میں تنہائی کا شکار ہوتی ہے‘ یا اگر وہ بازار چلی گئی تو

اتنی دیر لگا دی کہ بچوں کی بھوک وغیرہ کی کوئی فکر نہ ہو۔ اور اگر اس کام کے لیے آیا رکھ دی گئی ہو تو بھی گھر والوں کو کیا معلوم کہ آیا ان کو کیا کھلاتی ہے اور خود کیا کھاتی ہے۔ دوسرا وہ ماں والی محبت اور پیار تو دے ہی نہیں سکتی۔ یہ سب عوامل بچوں کی ذہنی نشوونما میں مثبت اور منفی اثرات مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔

ہمارے سامنے حضرت فاطمہ زہراؓ (جنت کی عورتوں کی سردار) کی مثال رہنی چاہیے جنہوں نے اپنے بچوں کی بہترین پرورش کی اور وہ خود گھر میں رہیں۔ سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہنا‘ چکی پیسنا‘ مشکیزے میں پانی بھر کر لانا‘ یہ معمولی کام نہیں ہیں۔ پھر بچوں کی تربیت بہترین انداز میں کرنے کے حوالے سے حضرت فاطمہؓ کا مقام بہت آگے ہے۔ ’’لعب‘‘ کے دور میں بچوں کو اچھا اخلاق‘ اچھا کردار‘ اچھے اعمال کر کے خود دکھانا اور بچوں کو سکھانا‘ اولاد کے حقوق اور والدین کے فرائض میں سے ہے۔

دوسرا دورِ زندگی : لَھْوٌ: یہ وہ عمر ہوتی ہے جب بچوں کی مصروفیات میں ایک مقصد‘ ایک رغبت اور دلچسپی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ بچوں کا جبلی شعور بیدار ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماحول میں دلچسپی لیتا ہے۔ اپنی سمجھ یا گھریلو تربیت کے مطابق بچوں میں یا تو اچھے رجحانات پیدا ہوتے ہیں یا پھر غلط تربیت اور حیوانی تقاضوں کی طرف رغبت کی وجہ سے برائیوں کی طرف میلان بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کے برائی کرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور چوری چھپے غلط کاموں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسی کو بلوغت اور جوانی کا دور کہا جاتا ہے۔ والدین اپنے اوپر تو کوئی حرف نہیں آنے دیتے اور بچوں کے بگڑنے اور برے کاموں کے کرنے کا قصوروار بھی سکول اور معاشرے کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ بعض والدین اپنے بچوں کی برائیوں پر یا تو جانتے بوجھتے پردہ ڈالتے ہیں‘ کیونکہ اس سے ان کی غلط تربیت ظاہر ہوتی ہے یا پھر بسا اوقات ان کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اولاد ان سے چھپ چھپ کر کیا گل کھلا رہی ہے۔ پہلے جو کھیل معصوم ہوتے تھے‘ اب ان کھیلوں میں اخلاقی بے راہ روی کا نمایاں عنصر شامل ہو چکا ہے اور یہ والدین سے چھپ کر ہی ہوتا ہے۔ اس عمر میں والدین کو یہ کہنے کی بجائے کہ اب بچے بڑے ہو گئے ہیں‘ اپنا برا بھلا سمجھ سکتے ہیں‘ ان کے بارے میں زیادہ محتاط اور ان پر نگرانی پہلے سے زیادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ پہلے گرنا‘ چوٹ کھانا‘ مار کھانا وغیرہ جسمانی تکالیف تھیں جس کی نگرانی ہر ماں کرتی ہے‘ لیکن اب اولاد کہیں سیرت و کردار‘ اخلاق اور شرم و حیا میں نہ گر جائے‘ اس کی دیکھ بھال بھی ازحد ضروری ہے۔ یعنی پہلے ظاہری جسم کی نشوونما‘ تاکہ قد بھی اچھا بڑھ جائے اور شکل



وصورت بھی بہترین ہو‘ اس کے لیے تَن مَن دھن لگایا تھا تو اب باطنی سیرت و کردار کی بلندی کے لیے مندرجہ بالا اوصافِ حسنہ کے ساتھ ساتھ اقامتِ صلوٰۃ‘ غضِّ بصر‘ والدین کی معروف میں اطاعت وغیرہ کے لیے بھی جدوجہد کرنی ضروری ہے۔ لیکن ان سب کے لیے خود اللہ کے بندے بننا اور بچوں کو بھی اپنی حاکمیت کی بجائے اللہ کی حاکمیت پر لگانا‘ بہترین طرزِ عمل ہے۔ اس ضمن میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو کی گئی نصیحت جو سورۂ لقمان میں بیان ہوئی ہے‘ والدین کے لیے بہترین مشعل راہ ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون کو ایک طرف رکھ کے پہلے اللہ سے محبت اور شرک سے اجتناب کا حکم دیا۔ پھر آخرت کے حوالے سے ان کو بہترین طرزِ عمل کی نصیحت کی۔ کاش ہماری تربیت میں بھی اپنی اولاد کی آخرت سنوارنے کے لیے جِدّوجُہد سرفہرست شامل ہو جائے۔

تیسرا دورِ زندگی: زِیۡنَۃٌ : زیب و زینت‘ زیبائش‘ خوبصورتی‘ مزین کرنا‘ اس کے مفہوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو کچھ زمین پر ہے اس کو ہم نے اس کی زینت بنا دیا۔ اسی طرح اولاد خصوصاً بیٹوں کو بھی زینت کہا گیا ہے: ﴿اَلۡمَالُ وَ الۡبَنُوۡنَ زِیۡنَۃُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا﴾ (الکھف:۴۶) ’’مال اور بیٹے دُنیوی زندگی کی زینت ہیں‘‘ — زینت وہ چیز ہوتی ہے جو ہم اپنی اصل پر مزید خوبصورتی کے لیے قائم کرتے ہیں۔ شروع سے تربیت اچھی ہو گی تو اولاد کی زیب و زینت‘ اخلاقیات اور اسلامی اقدار کے دائرے میں رہتے ہوئے ہو گی‘ لیکن اگر بچپن سے نشوونما کے خدوخال ہی اچھے نہیں تھے تو لامحالہ زینت کا محل و مقام اور مقصد اچھا نہیں ہو گا۔ ایک سلیم الفطرت بچہ اچھے کپڑے پہن کر نہا دھو کر اگر نماز کی تیاری کر رہا ہو گا تو دوسری قسم کا بچہ تیار ہو کر کسی کلب وغیرہ میں جانے کی تیاری کرے گا۔ زینت چونکہ اس کی جبلت کا حصہ ہے لہٰذا بالوں کی تراش خراش‘ کپڑوں کی ڈیزائننگ‘ فیشن کا شوق‘ زبان کے چٹخارے‘ پیسے سے محبت اور نفس پرستی کا دور یہی ہے۔

نفس‘ انسان کو بطن اور فرج کے بے لگام اور بے انتہا تقاضوں کے ذریعے بہکانا شروع کر دیتا ہے۔ اس دور میں نفس‘ شیطان کی شکل اختیار کر لیتا ہے‘ کیونکہ شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں کو ہر بری چیز مزین کر کے دکھاؤں گا اور یہ دور بطن اور فرج کے لحاظ سے اس کا من پسند دور ہے جس میں تمام برائیاں لذت بن کر سامنے آتی ہیں۔ بے انتہا مرغن اور چٹ پٹے کھانوں کا بے جا استعمال اور سینما گھروں اور بے حیائی اور فحش محفلوں میں جانا بھی پیسے کے ذریعے ہوتا ہے‘ اور پیسہ حاصل ہوتا ہے اس دور میں چوری سے اور جھوٹ بول کر یا سود لے کر۔ اس وقت موبائل اور انٹرنیٹ کی صورت میں بے حیائی بہت آسان اور سستی مل رہی

ہے۔ لہٰذا جنسِ مخالف کے ساتھ دوستی، فحش باتیں، ملاقاتیں، فحش حرکات حتیٰ کہ زنا کا عمل سب کچھ آسان ہو چکا ہے۔

اس عمر میں والدین کی نگرانی اولاد کو بہت زیادہ بری لگتی ہے۔ والدین کی ان معاملات میں ذرا سی روک ٹوک اولاد کو باغی بنا دیتی ہے۔ اولاد کو اپنے مزاج سے ہٹ کر کوئی بات اچھی نہیں لگتی۔ لہٰذا زینت کو اولاد پر کیسے مزین کرنا ہے اس کی فکر بہت زیادہ ہونی چاہیے۔ اولاد کے ساتھ دوستی اور پیار محبت کے ذریعے اولاد کا رُخ سیدھی طرف رکھنا مشکل ضرور ہے، ناممکن نہیں۔ البتہ حساس والدین کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں، کیونکہ وہ اولاد کے لچھن دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ اولاد ان کے کنٹرول سے باہر ہو گئی ہے۔ سرعام موبائل کا بے جا استعمال اور دوسری طرف تنہائی میں والدین کی غیر موجودگی میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور فیس بک وغیرہ کے ذریعے نفسانی خواہشات کو پورا کیا جا رہا ہوتا ہے۔

والدین کا فرض ہے کہ اس دور میں بچوں کو اسلامی طرزِ حیات سے نہ صرف روشناس کرائیں بلکہ اپنے اخلاق و کردار سے ان کو خوبصورت نمونہ مہیا کریں۔ ان کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بارے میں آگاہی دیتے رہیں اور بتائیں کہ والدین اور اولاد کا رشتہ کتنا خوبصورت، اہم اور مضبوط ہے۔ اولاد کو آخرت کے حوالے سے یہ ضرور باور کرائیں کہ اللہ کے ہاں نہ اولاد، والدین کے کوئی کام آئے گی اور نہ والدین اولاد کے کسی کام آسکیں گے۔

اولاد کی تربیت صرف یہ سوچ کر کریں کہ اولاد کے بارے میں اللہ کے ہاں ہم سے پوچھا جائے گا۔ یہ سوچ کر نہ کریں کہ بڑھاپے میں یہ ہمارا سہارا بنیں گے۔ اگر جوانی میں اللہ نے والدین کو ہمت وطاقت دی، ہدایت دی، گھر بار دیا تو کیا وہ اللہ ہمیں بڑھاپے میں چھوڑ دے گا؟ یا معاذ اللہ ہم اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے کہ اولاد ہی ہمیں سنبھالے گی تو سنبھلیں گے، وگرنہ خدانخواستہ ہم زندہ نہیں رہیں گے؟ مغربی معاشرے میں تو ایسی سوچ بھی نہیں ہوتی، پھر بھی والدین کو اولڈ ہومز بھیج دیا جاتا ہے۔ اگر ہم ایسی سوچ رکھ کر تربیت کریں گے تو اولاد کو بھی والدین کی تربیت میں بے لوثی کی بجائے خود غرضی نظر آئے گی اور وہ بھی بڑے ہو کر اپنی محبتوں (بیوی بچے) کو سنبھالنے کی فکر کریں گے نہ کہ والدین کی۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اولاد کو بس اللہ، قرآن اور نبی اکرم ﷺ کا حکم بتاتے جائیں اور خود عمل کرتے جائیں۔ اور پھر اولاد کی تربیت میں جہاں جہاں کوتاہی رہ گئی ہو اس کی تلافی اور آئندہ اچھی



تربیت کے لیے اللہ کے آگے دستِ دعا دراز رکھیں۔ بیٹوں کو بڑھاپے کا سہارا سمجھنے کی وجہ سے ہم کئی قسم کے گناہوں میں ملوث ہو جاتے ہیں، مثلاً بیٹیوں کو ہمیشہ بیٹوں سے کمتر سمجھنا، بیٹوں کو ہر معاملے میں، چاہے مال ہو یا گھریلو چیز، زیادہ اور بہترین حصہ دینا، وراثت کا سارا مال بیٹوں کو دے دینا، بیٹیوں کو ماں باپ کی خدمت کے لیے سمجھنا اور بیٹوں کو خدمت سے بالکل بری سمجھنا وغیرہ۔ یہ ہمارا دوغلا پن ہے اور یہ اللہ اور اس کے احکامات کے منافی عمل ہے۔ لہٰذا اولاد کو اللہ کی امانت سمجھ کر تربیت کرنا اور ان کو اللہ کے حکم پر لگانا، ان شاء اللہ ہمارے حق میں دنیا اور آخرت دونوں میں بے حد مفید ہوگا۔ دنیا میں بھی نیک اولاد والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنتی ہے اور آخرت میں تو بہترین صدقہ جاریہ ہوگی۔

**چوتھا دورِ زندگی: تَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ** : دنیا میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا، مال، اولاد، دُنیوی شہرت، غرض ہر دُنیوی چیز میں دوسروں کو اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھنا یا خود کو ان سے ہر معاملے میں برتر، اعلیٰ سمجھنا اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہنا درحقیقت تفاخر ہے۔ فخر اگر کرنا ہو تو دین کے معاملے میں، نیکی کمانے میں، اور خود اور اولاد کو صراطِ مستقیم پر رکھنے میں کریں۔ یاد رکھیں، فخر تکبر کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے، جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''تکبر میری چادر ہے، جس نے تکبر کیا اس نے گویا میرے کاندھے سے میری چادر کھینچنے کی کوشش کی۔''

دین میں سبقت لے جانے کی کوشش کرنا، خواہ اس پر دنیا والوں کی طرف سے بظاہر ذلت ورسوائی اٹھانی پڑے، یہ سابقون الاولون کے اوصاف میں سے ہے۔ لہٰذا اپنی اولاد کو بھی ایسا اعتماد دیں کہ دین پر عمل کرنے میں فخر محسوس کریں، نہ کہ اپنی ذات پر فخر کریں۔ مسلمان ہونے کے باوجود آج بھی ہمارے اندر یہ جہالت موجود ہے کہ ہم اپنی ذاتوں، قبیلوں، رسم و رواج اور رنگوں پر فخر کرتے ہیں اور ہماری اولاد بھی یہی کچھ سیکھتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر، اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، سوائے تقویٰ کے! سورۃ الحجرات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰىکُمْ﴾ ''یقیناً تم میں سب سے زیادہ عزت والا (باعث فخر) وہ ہے جس کے پاس تقویٰ کی دولت سب سے زیادہ ہے''۔ تقویٰ کی دولت دنیا کے جاہ وجلال اور مال و دولت کی طرح نظر آنے والی شے نہیں ہے۔ وہ تو

انسان کے دل میں ہوتا ہے۔ اس پونجی کو استعمال کر کے انسان دنیا میں ہی دنیا سے اور دنیا والوں سے غنی اور مالدار ہو جاتا ہے۔

یوں تو سید بھی ہو' مرزا بھی ہو' افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ کہ مسلمان بھی ہو!

ہمیں اپنے بزرگوں پر بھی فخر ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ ایسے تھے' ویسے تھے' لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے آباء واَجداد کیا کچھ کرتے تھے' بلکہ تم سے یہ سوال ہوگا کہ تم کیا کرتے تھے:﴿وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤١﴾﴾ (البقرۃ)۔

تھے تو وہ آبا تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو!

قرآن کی نظر میں فخر کے قابل لوگ انبیاء کرام علیہم السلام ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو خود بھی بہترین اور اولاد بھی بہترین' حضرت لقمان خود بھی بہترین' اولاد کو بہترین نصائح' حضرت یعقوب علیہ السلام خود بھی بہترین' اولاد کو بھی بہترین نصائح اور حضرت مریم علیہا السلام خود بہترین' ان کا بیٹا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بہترین۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم' اُمہات المؤمنین اور بنات النبی رضی اللہ عنہن کے اوصاف کا شمار تو ہم کر ہی نہیں سکتے۔ فخر کرنا ہو تو ان پر کریں جن پر اللہ بھی سلامتی بھیجتا ہے اور یہ وہ ہستیاں ہیں جو دنیا نہیں آخرت کی طالب تھیں۔ ان کے مقابلے میں جن لوگوں نے اپنے آپ کو دنیوی مال واسباب کے سبب قابلِ فخر سمجھا' قرآن نے ان کے فخر کو تا قیامِ قیامت اپنے پڑھنے والوں کے سامنے ذلت و رسوائی کا مقدر بنا دیا۔ ان کو ان کے جاہ وجلال اور مال و دولت' شہرت سمیت یا تو زمین میں دفنا دیا یا سمندروں میں غرق کر دیا۔ ان میں فرعون' ہامان' قارون' ابوجہل' ابولہب' ولید بن مغیرہ (جس کا تذکرہ قرآن میں مال کے ساتھ خصوصاً اولاد کے فخر میں آتا ہے) وغیرہ جیسے بدبخت لوگ اپنے فخر سمیت نسیاً منسیاً کر دیے گئے۔

انسان کا المیہ یہ ہے کہ اپنی قیمتی زندگی' جو اس کو ایک بار ہی ملی ہے' کے قیمتی لمحات کو لہو ولعب اور زینتوں میں ضائع کرتا ہوا اور اپنی ساری توانائیاں اسی دنیا کی زندگی میں کھپاتا ہوا زندگی کی اس سٹیج پر جا پہنچتا ہے جہاں انسان اپنی سوچ میں مزید پختہ ہو جاتا ہے اور وہ آباء واَجداد' اولاد اور مال ودولت پر فخر کرتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ میں بقیہ زندگی میں محفوظ ہو گیا ہوں۔ میرا مستقبل میری اولاد اور مال ودولت کی شکل میں میرے سامنے ہے۔ مال ودولت اور اولاد پر فخر کے لحاظ سے امیہ بن خلف' ولید بن مغیرہ اور قارون جیسے لوگ آج بھی مل جائیں



گے جنہوں نے اللہ پر توکل کے بجائے مال ودولت اور اولاد پر توکّل کیا ہوا ہے۔ سورۃ الکہف میں بھی ایسے ہی ایک شخص کا تذکرہ ہے جس کو اپنی دولت پر فخر تھا تو قرآن نے اس کو شرک کے زمرے میں لا کھڑا کیا۔ مال ودولت اور اولاد پر فخر ان کے کوئی کام نہ آیا اور اولاد ان کو برے انجام سے نہ بچا سکی۔

پانچواں دورِ زندگی: تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ : تفاخر سے اگلی سٹیج ''تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ'' ہے۔ اگر ان دو چیزوں یعنی مال اور اولاد پر فخر کو کم نہ کیا جائے تو مرتے دم تک ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ التکاثر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿١﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿٢﴾﴾

''تمہیں کثرت کی طلب نے ہلاک کر ڈالا' یہاں تک کہ تم قبروں میں پہنچ گئے۔''

ہلاک ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں کہ تم مر گئے' بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان مادی چیزوں پر فخر' گھمنڈ اور کثرت کی فکر نے ہی تمہیں ہلاک کر دیا اور یہ چیزیں تمہارے کچھ کام نہ آئیں۔ اولاد اور مال کو قرآن نے دشمن اور فتنہ کہا ہے:﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ﴾ (الانفال:۲۸) ''جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد فتنہ (آزمائش) ہیں''—— ''فتنہ'' سنار کے پاس ایک کسوٹی (پتھر) ہوتی ہے جس پر سونے کو رگڑ کر معلوم کیا جاتا ہے کہ سونا اصلی ہے یا نقلی' یعنی کھرا کھوٹا معلوم ہو جاتا ہے۔ ہمارا معاملہ چونکہ اولاد کے ساتھ ہے اس لیے اولاد کو فتنہ کہا۔ یعنی ہم پرکھے جا رہے ہیں کہ اولاد کے حق میں حقیقتاً مخلص ہیں یا ان کی غلط تربیت کر کے ہم اپنے آپ کو کھوٹا ثابت کر چکے ہیں۔ ع ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے'' کے مصداق خود ہمارا معاملہ اگر ناکامی والا ہے تو ہم اپنی اولاد کا بھی خسارہ کریں گے۔ **اعاذنا اللہ من ذٰلك!**

یہ حالات ہمارے مسلمان معاشرے میں تقریباً ہر جگہ پائے جاتے ہیں جہاں اولاد کی تعلیم وتربیت بالکل غلط انداز سے کی جاتی ہے۔ جو لوگ ذرا دین کی طرف مائل ہیں وہ اپنے فرقوں کی تعلیم دیتے ہیں' جو بالکل دین سے فارغ ہیں وہ دین کے بنیادی پہلوؤں سے بھی غافل ہیں' لیکن نیتاً اور ارادتاً دونوں طبقے اولاد کو بڑھاپے کا سہارا سمجھ کر جی رہے ہیں یا مال کو جمع کر کے تجوریوں میں بھر کر مستقبل کو محفوظ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ مال و دولت تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس بھی بہت تھا۔ خلفائے راشدین میں سے حضرت ابوبکر اور

حضرت عثمان ؓ کے پاس تو آخری دم تک مال کی کثرت تھی‘ لیکن وہ اس مال کو اپنی ملکیت کی بجائے اللہ کی امانت سمجھتے تھے اور دنیا میں اپنا مستقبل سنوارنے کی بجائے آخرت کے لیے خرچ کرتے تھے۔ یہ لوگ مال و اولاد پر فخر کرنے کی بجائے ان کے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے تھے کہ یہ مال کہیں ہمیں تباہ و برباد نہ کر دے۔ حضرت اسماء اور حضرت خنساء ؓ جیسی قابلِ تقلید خواتین صحابیات نے اپنی اولاد کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیا اور کامیاب ہوگئیں‘ جبکہ ہم اپنی اولاد کو فی سبیل الدنیا تیار کرتے ہیں اور اپنے اموالِ دنیا چمکانے میں لگا دیتے ہیں۔ اس طرح تفاخر اور تکاثر فی الاموال والاولاد میں افراط وتفریط کا شکار ہوکر اولاد کے حقوق تلف کرنے اور اپنے فرائض میں غفلت کا شکار ہوتے ہیں۔

## والدین کے فرائض کا خاکہ

مضمون کے شروع میں مذکورہ آیات کو ذہن میں اگر مستحضر رکھیں تو والدین کے فرائض اس طرح مختصراً سامنے آتے ہیں:

(۱) اپنی اولاد کو تادمِ آخر دوزخ کی آگ سے بچانے کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہنا۔

(۲) اولاد کی بے جا محبت میں گرفتار ہوکر کہیں خود والدین حرام اور ناجائز کاموں میں ملوث نہ ہوجائیں اور خود کو کھوٹا ثابت نہ کریں۔ یہ والدین کے لیے محتاط رویہ بیان کیا گیا ہے۔

(۳) والدین محتاط رہیں کہ یہ اولاد کہیں ان کی دشمن نہ ثابت ہوجائے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ بچے کی پیدائش سے لے کر والدین کی زندگی کے آخر تک انسان پر کھا جا رہا ہوتا ہے کہ بچوں کی ناحق حمایت‘ جھوٹی تعریفیں‘ بچوں کی برائیوں کو دوسروں کے سر تھوپنا‘ اور اپنی اولاد پر توکل کرنا‘ یہ سب باتیں اولاد کے حق میں جانے کی بجائے دشمنی کی صورت میں سامنے آئیں گی اور حقیقت کے اعتبار سے اولاد دنیا و آخرت میں ہماری دشمن ثابت ہوگی اور والدین کو غلط تربیت اور اپنے اصل فرض سے غفلت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اعاذنا اللّٰہ من ذٰلک!

ہے۔ بہرحال جس ربِّ عظیم کے دین کی خدمت وہ اپنی زندگی کا شعار بناتا ہے وہ رب اُسے دائمی زندگی کے جن دائمی انعام واکرام سے نوازتا ہے' وہ ہمارے تصور اور وہم وگمان سے بھی ماوراء شے ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے بعض خیالات وافکار سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہوسکتا ہے اور یہ اُن کا حق ہے' لیکن کوئی ظالم سے ظالم انسان بھی اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا کہ انہوں نے اس تیسری جہت میں زندگی کھپا دی۔ سفر وحضر ہو' صحت وتندرستی کی کیفیت ہو یا حالتِ بیماری میں بستر پر پڑے ہوں' نجی محفل ہو یا عوامی جلسہ ہو' ایوانِ صدر میں گفتگو کا موقع ملے یا کسی پسماندہ بستی میں خطاب کا دوست واحباب کی محفل ہو یا بدترین دین دشمن سیکولر اور ملحد قسم کے لوگوں سے پالا پڑ جائے' بات اللہ کے دین کی کی جائے گی اور محض مذہبی بنیادوں پر وعظ و نصیحت ہی نہیں بلکہ ڈٹ کر اوّلاً پاکستان میں اور بعد ازاں عالمی سطح پر اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی یعنی نظامِ خلافت قائم کرنے کی کھل کر بات ہو گی۔ کوئی مخالفانہ ماحول' کسی قسم کی کوئی مصلحت یا کسی حکمران کا رعب داب انہیں یہ اعلان کرنے سے نہیں روک سکتا تھا کہ اُمتِ مسلمہ کے تمام مسائل اور مصائب کی جڑ دین سے دوری اور غیر اسلامی نظام کا مسلّط ہونا ہے۔ اُن کی رائے میں اُمت کی ذلت وپستی کا بنیادی سبب امت کی قرآن سے مہجوری تھی۔ آج سیاسی اور مذہبی دنیا کا طاقتور ترین انسان بھی پاپولر نقطہ نظر کی مخالفت نہیں کرسکتا' لیکن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کبھی عوامی سطح پر مخالفت کے خوف سے حق گوئی سے باز نہ رہے کہ ع ''آئینِ جواں مرداں حق گوئی وبے باکی!''

ہر وہ شخص جو ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے محبت وعقیدت کا دعویدار ہے اور اُن سے قلبی لگاؤ رکھتا ہے' سن لے اور کان کھول کر اچھی طرح سن لے کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے کسی برسی منانے کی' اُن کی شخصی خوبیوں پر زمین وآسمان کے قلابے ملانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اُن کی روح ایسے طرزِ عمل پر شاداں ہو گی۔ ہاں اگر کوئی نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام اور بنائے خلافت کو استوار کرنے میں تن من دھن لگا دے گا تو وہ حقیقی معنوں میں اُن کی روح کی شادمانی کا باعث بنے گا۔ یاد رکھیے' ہم سب کے رب نے اپنی آخری کتاب میں واضح طور پر فرما دیا ہے کہ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝۵﴾



''ہم نے انسان کو بہترین تقویم پر پیدا کیا۔ پھر وہ ہو جاتا ہے نچلوں میں سب سے نچلا''۔ (التین) یعنی ہر انسان کو ایک جیسی خلقت اور ایک جیسا ملتا جلتا جسمانی حلیہ عطا ہوتا ہے' لیکن ایک شخص اگر نیکی کی راہ اختیار کرے تو سچے اور برحق نظریات وافکار' عقائد اور صالح اعمال کی بنیاد پر عظمت اور افتخار اُس کا تعاقب کرتے ہیں' لیکن اگر وہ کج روی اختیار کرے اور بداعمالی پر اُتر آئے تو دوسری مخلوقات سے بھی ہیچ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قابلِ تقلید شے صحیح نظریات اور اچھے اعمال ہیں۔ شخصیت کی عزت وتکریم اسی حوالہ سے ہوگی۔ عزت واحترام کوئی وراثت نہیں ہوتی کہ اولاد میں تقسیم یا منتقل ہو جائے' لیکن اگر بیٹا باپ کے نقشِ قدم پر چلے تو باپ پر آفرین اور بیٹے پر صد آفرین ہے۔ کوئی شخص محض اپنی ذات میں عزت واحترام کا حق دار نہیں ہوگا۔ قرآن و سنت سے ماخوذ یہی وہ درس تھا جو ڈاکٹر اسرار احمدؒ اپنی زندگی میں دیتے تھے۔ تاہم شریعت کی مقررہ اور طے کردہ حدود میں رہتے ہوئے ایسے عظیم لوگوں کے لیے اپنے دل میں محبت رکھنا اور اُس کا اظہار کرنے کی ممانعت نہیں۔ ان ہی حدود کا خیال رکھتے ہوئے ہم اُن کی یاد میں غالب کا ایک شعر پیش کریں گے ۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب' قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور!

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ آج سے تین سال قبل ۱۴/اپریل کو اپنے سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے تھے۔ زندگی کا ایک طویل سفر ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی معیت میں طے کرنے کی بنیاد پر ہم بآسانی اور پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے محبت کرنے والا کوئی دعویدار دینِ حق کے قیام اور نفاذ کی جدّوجہد میں اگر عملی حصہ نہیں ڈالتا تو تمام تر محبت اور عقیدت کے باوجود وہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نظریات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ (واللہ اعلم!)

❁❁❁

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

Apr. 2013
Regd. CPL No. 115
vol. 62
No. 4

Monthly **Meesaq** Lahore

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

دینی و عصری علوم کی منفرد دانش گاہ

# کُلّیۃ القرآن (قرآن کالج)

(وفاق المدارس سے الحاق شدہ)

بانی: ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

بورڈ / یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ درس نظامی کا مکمل نصاب

قیام و طعام کی سہولت موجود ہے

علم دین اور فکر حاضر کے حسین امتزاج کی ایک منفرد کوشش

## خصوصیات

- ☆ تجربہ کار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرسین
- ☆ قرآنی موضوعات پر خصوصی فکری و عملی رہنمائی
- ☆ تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام
- ☆ طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے بہترین مواقع
- ☆ علوم اسلامیہ کے ساتھ جدید علوم یعنی درس نظامی مع میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے
- ☆ اسباق وفاق المدارس العربیہ اور بورڈ کے نصاب کے مطابق
- ☆ خوبصورت عمارت اور کلاس روم
- ☆ کمپیوٹر لیب ☆ بہترین اور مکمل لائبریری
- ☆ کانفرنس اور ڈائننگ ہال
- ☆ اسلامی اخلاقیات کی مکمل پابندی
- ☆ رہائش کے لیے بہترین ہوادار اور روشن کمرے
- ☆ خوراک حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق
- ☆ طلبہ کی تدریسی ضروریات پوری کرنے میں معاونت
- ☆ وقت کا موثر استعمال
- ☆ مواقع تفریح کی فراہمی

## نشستیں محدود ہیں!

مڈل کے امتحان کے نتائج کے منتظر طلبہ بھی درخواست جمع کرا سکتے ہیں

مقامی و دیگر شہروں کے طلبہ کے لیے درجہ اولیٰ و ثانیہ (میٹرک) اور ثالثہ میں نئے تعلیمی سال کے داخلے جاری ہیں

داخلہ لیٹ فیس کے ساتھ **10 اپریل تک**

## معلومات داخلہ

- ☆ نئے سال کے لیے خواہش مند طلبہ کلیۃ القرآن آفس سے داخلہ فارم اور انٹری ٹیسٹ کے لیے سلیبس حاصل کر سکتے ہیں۔
- ☆ داخلہ فارم کے لیے انٹری ٹیسٹ اور انٹرویو پاس کرنا لازمی ہے۔
- ☆ مزید معلومات کے لیے ناظم اعلیٰ کلیۃ القرآن یا نائب ناظم سے رابطہ کریں۔
- ☆ اسباق شوال میں شروع ہوں گے۔

## شرائط داخلہ

- ☆ درجہ اولیٰ کے لیے متوسطہ یا مڈل پاس، ثانیہ کے لیے حفظ اور اولیٰ پاس اور ثالثہ کے لیے وفاق المدارس سے ثانیہ اور بورڈ سے میٹرک پاس ہونا لازمی ہے۔
- ☆ دیگر تعلیمی اداروں سے کریکٹر سرٹیفکیٹ
- ☆ اپنے علاقے کے عالم دین یا سابقہ مدرسے سے تصدیق نامہ
- ☆ سرپرست کی طرف سے ضمانت نامہ
- ☆ ٹیسٹ اور انٹرویو میں کامیابی

برائے رابطہ

ناظم اعلیٰ **کُلّیۃ القرآن** (قرآن کالج)
191-اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون: (042)35860024-35833637
پرنسپل: طارق مسعود 0321-4506196

ذیلی دفتر: **قرآن اکیڈمی**
K-36 ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ فون: (042)35869501-3
فیکس: (042)35834000، ای میل: irts@tanzeem.org



# زندگی کے سارے سُکھ، صحت اور تن درستی سے ہیں

## تن سُکھ سے تن درست

تن سُکھ جسم و جاں کو تقویت پہنچاتا ہے، نظامِ ہضم اور افعالِ جگر کی اصلاح کرتا ہے

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔
آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ ہمدرد خریدتے ہیں۔ جائز منافع بین الاقوامی شہر علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

ہمدرد کے متعلق مزید معلومات کے لیے ویب سائٹ ملاحظہ کیجیے:
www.hamdard.com.pk